FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

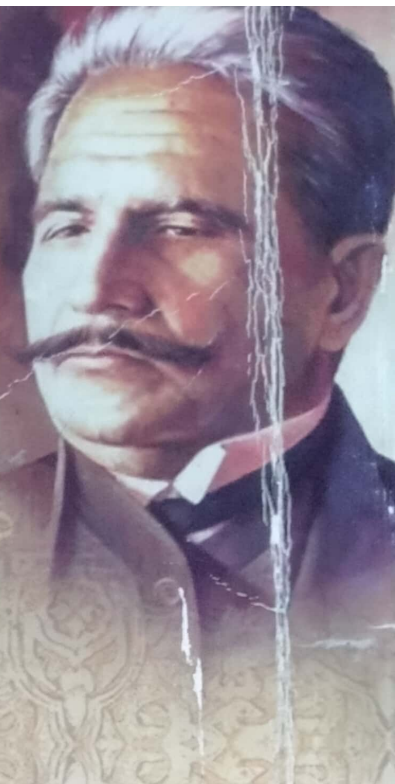

اُردو

برائے جماعت نہم

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

نیشنل بُک فاؤنڈیشن
بطور
وفاقی ٹیکسٹ بُک بورڈ، اسلام آباد

اُردو

برائے جماعت نہم

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

نیشنل بُک فاؤنڈیشن
بطور
وفاقی ٹیکسٹ بُک بورڈ، اسلام آباد

ہمارا نصب العین

معیار ● حاصلات ● رسائی ● اُسلوب

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

©2021ء نیشنل بک فاؤنڈیشن، بطور وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ، اسلام آباد
جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں
نیشنل بک فاؤنڈیشن کی باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا۔

درسی کتاب: اُردو برائے جماعت نہم

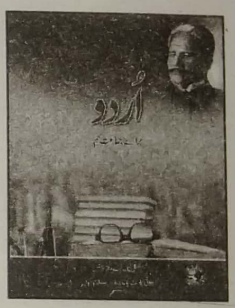

مؤلفین: پروفیسر ڈاکٹر خالد اقبال یاسر (تمغۂ امتیاز)، پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر امجد اقبال
نظر ثانی: پروفیسر انیس الحسنین، پروفیسر شاہد محمود
ڈیزائننگ، لے آؤٹ: شہزاد احمد، ذوالفقار احمد، کامران مجید
ڈیسک آفیسر، نصابیات: محمد ناصر خان، ڈاکٹر شفقت علی جنجوعہ
زیرِ انتظام: نیشنل بک فاؤنڈیشن

طبع اول:	مارچ 2021ء	تعداد: 100000
طبع دوم:	جولائی 2021ء	تعداد: 25000
طبع سوم:	اگست 2021ء	تعداد: 27000

قیمت: -/90 روپے
کوڈ نمبر: STU-450
آئی ایس بی این: 978-969-37-1232-2
طابع: محمود برادرز پرنٹرز، راولپنڈی

Test Edition

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http://www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261124, 9260391, 9261125
یا ای میل: nbftextbooks@gmail.com

پیش لفظ

اُردو برائے جماعت نہم قومی نصاب 2006ء کے مطابق تیار کی گئی ہے اور یہ پہلی بار 2021ء میں شائع ہو رہی ہے۔

جماعت ہشتم کی سطح کے بعد زبان و بیان میں قدرے رفعت اور طرزِ بیان میں ادبیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و نثر اور زبان کے دیگر اصول و اسالیب کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ مشقی سلسلے میں بھی نصابی حاصلات کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چنانچہ نویں جماعت کی درسی کتاب کی تیاری کے دوران اِن پہلوؤں کو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں پاکستانی اُردو کے جدید تقاضوں کی طرف بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جنھیں اگلی جماعتوں میں بہت حد تک پورا کیا جائے گا۔ خاص طور پر نثر کی مختلف اصناف، صحافتی اُردو، دفتری اُردو، عدالتی اُردو، سائنسی اور تکنیکی اُردو، کمپیوٹر اور موبائل فون کی زبان کے بہت سے ایسے پہلو ہیں، جن سے طلبہ کو روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ اس جماعت میں صحافتی اور سائنسی اُردو پر باقاعدہ سبق بھی شامل ہیں۔ یاد رہے کہ ہمیں زبان کا استعمال سکھانا ہے۔ اساتذہ کو زیادہ زور اسی پہلو پر دینا ہوگا۔ خاص طور پر کمپیوٹر ٹیکنالوجی، موبائل فون اور ویب سائٹس کے حوالے سے اُردو کو جو حیثیت حاصل ہے، اسے تدریس کا حصّہ بنانا ہوگا۔ یہ ذمہ داری اُردو کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے روزمرہ اسباق میں کس طرح سے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لائبریری سے طلبہ کے ربط و ضبط اور شوق کی ترویج کے لیے کہیں کہیں اضافی معلومات اور سرگرمیاں دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی اساتذہ کی رہنمائی درکار ہوگی۔ چوکھٹوں میں کچھ اضافی معلومات دی گئی ہیں، ان کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ اس سے طلبہ کو نفسِ مضمون سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسباق، منظومات اور غزلیات کے آخر میں طلبا و طالبات کی رہنمائی کے لیے اضافی معلومات کی غرض سے مصنفین اور شعرا کا مختصر تعارف بھی دے دیا گیا ہے۔

معیار کی رفعت، تدریسی حاصلات، ذہنی رسائی اور اُسلوب کی پیروی ہمارا نصب العین ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے موثر تدریسی مراحل کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اور خصوصی کاوشیں بروئے کار لاتے ہوئے مواد اور مثالوں سے اس درسی کتاب کو شائع کیا ہے۔ اس ضمن میں تمام رفقا کی مساعی لائقِ تحسین ہیں۔

حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ کتاب غلطیوں سے پاک ہو۔ حکومتِ پاکستان کی ہدایات کے مطابق کتابوں میں اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ مختلف حوالوں سے وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے حوالے سے جو نوٹیفکیشن جاری ہوتے رہے ہیں ان پر بھی مکمل طور پر عمل کیا جائے۔ ان کی روشنی میں درستگی کر دی گئی ہے۔ تاہم پھر بھی آپ سے درخواست ہے کہ اگر اس کتاب میں کسی قسم کی لسانی اور علمی نوعیت کی غلطیاں ملیں تو ہمیں ان سے آگاہ فرمائیں اور مزید بہتری کے لیے اپنی تجاویز پیش کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں ان کی درستگی کی جاسکے اس کے لیے ادارہ آپ کا بے حد شکر گزار ہوگا۔

اس سلسلے کی نئی تیار کردہ یہ درسی کتاب اب تدریس کے لیے طلبہ اور اساتذہ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر راجہ مظہر حمید

مینجنگ ڈائریکٹر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

فہرست اسباق

نمبر شمار	عنوان		صفحہ نمبر
	حصّہ نثر		
۱۔	سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم	(مضمون)	شبلی نعمانی	6
۲۔	قومی اتفاق	(مضمون)	سرسید احمد خان	11
۳۔	غالب کا اچھوتا پن	(تنقید)	الطاف حسین حالی	16
۴۔	شاعروں کی باتیں	(تذکرہ)	محمد حسین آزاد	21
۵۔	توبتہ النصوح	(ناول)	ڈپٹی نذیر احمد	25
۶۔	زیور کا ڈبا	(افسانہ)	پریم چند	33
۷۔	آرام و سکون	(ڈراما)	امتیاز علی تاج	42
۸۔	نئی ہمسائی	(ڈراما)	میرزا ادیب	50
۹۔	نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر	(مزاح)	مرزا فرحت اللہ بیگ	59
۱۰۔	سماج	(مزاح)	شفیق الرحمان	65
۱۱۔	کاربکاؤ ہے	(مزاح)	کرنل محمد خان	69
۱۲۔	خطوط بنام مدیر	(صحافتی مضمون)	ڈاکٹر مسکین علی حجازی	74
۱۳۔	ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطے کی دُنیا	(سائنسی اُردو)	پروفیسر امجد اقبال	78
	حصّہ نظم		
۱۔	ربِّ کائنات	(حمد)	الطاف حسین حالی	82

۲۔	نعت	امیر مینائی	85
۳۔	برسات کی بہاریں (ہیئت: مخمس ترجیع بند)	نظیر اکبر آبادی	88
۴۔	دُعا (نظم)	علامہ محمد اقبال	92
	حصّہ غزل		
۱۔	اُلٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا	میر تقی میرؔ	96
۲۔	دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے	حیدر علی آتشؔ	99
۳۔	کوئی اُمید بر نہیں آتی	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	102
۴۔	لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں	بہادر شاہ ظفرؔ	104
	فرہنگ		106

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

1 سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سیرتِ اطہر کے مختلف پہلوؤں کو جان سکیں۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ جس ترتیب و توازن کی اعلیٰ ترین مثال تھی، اس سے آگاہ ہو سکیں۔
- شبلی نعمانی کے ہاں تاریخ، عقیدت اور ادب کے درمیان ہم آہنگی کے تصور سے آشنا ہو سکیں۔
- سیرت نگاری کے فن سے روشناس ہو سکیں۔

پڑھیں

اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاقِ حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اس کی اس شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدّل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی، گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں، اسی کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے شروع فرمایا، اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے، سنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کسی خاص دن یہ کرتے تھے، انھوں نے جواب دیا "لاکان عملہ دیمۃ" آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اختیار کر لی ہمیشہ اس کی پابندی کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نکو سیرت تھے، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود نہ منہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بہ نفس نفیس مہمان داری کے تمام کام انجام دیے، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے، ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گزاری کی ہے، اس لیے میں خود ان کی خدمت گزاری کرنا چاہتا ہوں۔

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جب نکاح ہوا اور دعوت ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی مجلس میں شریک تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اٹھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ تک گئے، واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری۔

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو، اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

باوجود اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا تاہم کسی کا بے ضرورتِ شدید سوال کرنا آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم پر سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے کہ ”اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھ پیٹھ پر لاد لائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔“

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آکر شامل ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

قبیصہ نام کے ایک صاحب تھے، وہ مقروض ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا ”اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے زیادہ زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے، لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہیے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آگئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے، جب تک اس کی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اس کو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔“

شرک کا پہلا دیباچہ انبیا اور صلحا کی مبالغہ آمیز تعظیم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ ”میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریمؑ کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔“

قیس بن سعد کہتے ہیں ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیسِ شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کو سجدہ کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں، فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس درد و صدمہ سے کم از کم اجرامِ سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی قسم کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند

انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا لیکن نبوت کی شان اس سے بدر جہا ارفع و اعلیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیاتِ قدرت میں سے ہے، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔

خدا نے قرآن مجید میں اولوالعزم من الرسل کہہ کر انبیائے کبار کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم چوں کہ خاتم الرّسل تھے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذات میں ودیعت کیا تھا، ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر اتم ہے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے، بے یار و مددگار دعوتِ حق کی صدائیں بلند کرتا ہے، ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے لیکن وقارِ نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چُور چُور ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ دن آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جاں نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے۔

مصنّفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم جب تک مکہ میں تھے، پیغمبر تھے، مدینہ میں پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم تمام عرب کے زیر نگیں ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے، صحیح بخاری کتاب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تین صاع جَو پر گروی تھی، جن کپڑوں میں آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا ہے۔

انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کم یاب اور نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگذر ہے لیکن حاملِ وحی و نبوت کی ذاتِ اقدس میں یہ جنس فراواں تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے لیکن اخلاق کے دائرۂ شریعت میں آکر یہ فرضیت مکروہِ تحریمی بن جاتی ہے، تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)

شبلی نعمانی ضلع اعظم گڑھ کے ایک نواحی قصبے بندول میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے۔ مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ مولانا ارشاد حسین سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا احمد علی بھی ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ جدید مغربی تنقید کے اصول اور فرانسیسی زبان پروفیسر تھامس آرنلڈ سے سیکھی۔ شبلی نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ مسلم کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ سرسید کے نامور رفقاء میں سے ایک تھے۔ اگرچہ ان کے درمیان اختلاف بھی رہا۔

۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد دکن میں چند سال تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد پہلے دارالعلوم ندوہ کے ناظم رہے اور پھر ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ آکر وہاں دارالمصنّفین قائم کیا۔ انھیں انگریزی حکومت نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔

ان کی مشہور تصنیفات میں **الفاروق**، **المامون**، **شعر العجم**، **موازنۂ انیس و دبیر**، **سفر نامہ روم و شام** اور آٹھ جلدوں پر مشتمل **مقالاتِ شبلی** شامل ہیں۔ **سیرۃ النبی** شبلی کا ایک اہم کارنامہ ہے جسے ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے مکمل کیا ہے۔ شبلی کی نثر سادہ، رواں اور منطقی ہوتی ہے۔ بات میں ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ وہ محاوروں کا استعمال کبھی کبھار کرتے ہیں۔ خیالات کے بیان میں الفاظ کی تکرار سے ان کی نثر میں آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں:

الف۔ اخلاق کا دقیق نکتہ کیا ہے؟

ب۔ مجالسِ صحبت میں ناگوار باتوں پر آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا طریقہ کار کیا ہوتا تھا؟

ت۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اپنے تمام کاموں میں کس اصول کی پابندی فرماتے تھے؟

ج۔ سنت کی تعریف بیان کریں؟

خ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم مصافحے کے دوران کس بات کا خیال رکھتے تھے؟

د۔ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے نجاشی کے ہاں سے آنے والی سفارت کی کس طرح مہمان نوازی فرمائی؟

و۔ پردے کی آیت کب نازل ہوئی؟

ہ۔ حجۃ الوادع کے موقع پر صدقات کا مال تقسیم کرتے ہوئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دو تنومند لوگوں کو کیا نصیحت فرمائی؟

ء۔ کن تین لوگوں کو سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا روا ہے؟

ی۔ انسان کے ذخیرہ اخلاق میں سب سے کم یاب اور نادر الوجود

سوال نمبر2: مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں

جنس فراواں　　نادر الوجود　　مکروہ تحریمی　　زر و سیم　　اولوالعزم　　اجرام سماوی　　مبالغہ آمیز

ابرِ کرم　　صیغۂ تعمیم　　نکو سیرت

سرگرمی

کسی بھی نوعیت کی تقریب کی کارروائی تحریر کی جائے تو اسے رُوداد بھی کہا جا سکتا ہے۔ رُوداد کے لغوی معنی سرگزشت یا ماجرا کے ہیں۔ حقائق کا بے کم و کاست بیان چاہے وہ کسی اجلاس سے متعلق ہو یا کسی واقعہ کے بارے میں رُوداد کہلاتا ہے اور رُوداد موضوعات کے لحاظ سے ادبی، دفتری یا صحافیانہ ہو سکتی ہے۔ صحافیانہ رُوداد دراصل خبر یا خبروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور اخبار کی ضروریات اور تقاضوں کے پیشِ نظر لکھی جاتی ہے۔ ادبی رُوداد کو رپورتاژ بھی کہتے ہیں۔ اگر آپ نے کوئی سفر کیا ہو تو اس کی رُوداد لکھیں۔ مندرجہ ذیل نکات کو ملحوظ رکھیں:

۱۔ تمام ضروری نکات درج ہوں۔

۲۔ افراد، مقامات اور کتابوں کے نام دُرست ہوں۔

۳۔ حقائق کے خلاف کچھ نہ ہو۔

۴۔ اپنے ذاتی تاثرات، احساسات اور جذبات اس طرح سے لکھے جائیں کہ دوسروں کے مشاہدے اور تصویریں واضح ہو سکیں۔

۵۔ جملے چھوٹے اور مسلسل ہوں۔

۶۔ ایک پیرا گراف میں صرف ایک ہی بات درج ہو۔

دفتری رُوداد نویسی

۱۔ رُوداد کے آغاز میں اجلاس کی نوعیت کا ذکر ہونا چاہیے مثلاً "مقتدرہ قومی زبان کی ہیئت حاکمہ کا اجلاس" اگر اس ادارے کا میعادی اجلاس منعقد ہوتا تو پھر اجلاس کا نمبر شمار بھی درج کرنا چاہیے مثلاً "علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی ہیئت حاکمہ کا آٹھواں اجلاس۔

۲۔ اگر اجلاس ہنگامی، غیر معمولی یا خصوصی نوعیت کا ہو تو اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اجلاس جس سلسلے میں منعقد ہو رہا ہے اس کے بارے میں ذکر کیا جائے مثلاً "اجلاس وزارتی کمیٹی بہ سلسلہ تقریبات یوم آزادی"

۳۔ اجلاس کی نوعیت، انعقاد کی تاریخ، وقت اور مقام کا ذکر رُوداد کی پیشانی پر بطور عنوان تحریر کیا جاتا ہے مثلاً رُوداد اجلاس وزارتی کمیٹی منعقدہ یکم جنوری ۱۹۹۰ء، بروز پیر، بوقت دس بجے صبح، بسلسلہ تقریبات یوم آزادی"۔

۴۔ اس کے بعد اجلاس کے انعقاد کی تاریخ، دن، وقت اور مقام تحریر کیا جاتا ہے۔

۵۔ یہ بھی تحریر کیا جاتا ہے کہ اجلاس کس سلسلے میں منعقد ہوا۔

۶۔ صدر اجلاس اور حاضر اراکین کے نام تحریر کیے جاتے ہیں۔ حاضرین اجلاس کے نام کے سامنے ان کی حیثیت کی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔

۷۔ بعض لوگ اجلاس میں رکن کی حیثیت سے نہیں بلائے جاتے لیکن وہ بطور ماہر یا کسی اور وجہ سے بلائے جاتے ہیں یہ لوگ اجلاس کی کارروائی میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن رائے شماری کے وقت انھیں رائے دینے کا حق نہیں ہوتا۔ حاضرین اجلاس کا نام لکھتے وقت ان کی حیثیت واضح کرنا بھی ضروری ہے۔

۸۔ حاضرین کے ساتھ ساتھ غیر حاضر اراکین اور غیر حاضری کی وجہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

۹۔ اگر کسی ادارے کا میعادی اجلاس منعقد ہو تو پھر ہر اجلاس میں گزشتہ اجلاس کی رُوداد بھی منظوری کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

۱۰۔ مختلف اُمور کے بارے میں رُوداد کی ترتیب وہی رکھی جاتی ہے جن کا تعین پیش نامے میں کر دیا گیا ہو۔

۱۱۔ اجلاس کی رُوداد لکھنے کے تین اسلوب ہیں:-

الف۔ ہر شق پر ہونے والی بحث کی پوری تفصیل قلم بند کی جاتی ہے۔ اس کے بعد فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

ب۔ اجلاس میں پیش کیے جانے والے امور اور ان پر ہونے والے فیصلوں کو اختصار سے لکھا جاتا ہے۔ بعض اداروں میں تو پیش نامہ اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اس کی عبارت معمولی رد و بدل سے رُوداد بن جائے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ پہلے سے کیے گئے فیصلوں کی اجلاس کے ذریعے توثیق کرائی جا رہی ہے۔

ج۔ ہر شق پر ہونے والی بحث کو مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

۱۲۔ رُوداد میں کسی شخص کے انفرادی نقطۂ نظر کو عام طور پر درج نہیں کیا جاتا لیکن اگر کوئی شخص درخواست کرے تو اس کی رائے کو رُوداد میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ رُوداد کے اختتام پر صدر اجلاس اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۱۴۔ رُوداد لکھتے ہوئے ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے۔

۱۵۔ رُوداد جامع انداز اور سادہ زبان میں اختصار کے ساتھ لکھی جاتی ہے۔ مشکل یا طویل الفاظ و تراکیب کے مقابلے میں سادہ اور مختصر تراکیب و الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔ غیر مانوس الفاظ کی جگہ مانوس الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تحریر میں زور پیدا کرنے کے لیے مترادفات استعمال نہیں کیے جاتے۔ صفات و قیود کا بے جا استعمال بھی نہیں کیا جاتا۔

۱۶۔ صحتِ تحریر برقرار رکھنے کے لیے قواعد، صرف و نحو، ہجوں اور رموز اوقاف کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے مختصر ذیلی سرخیاں قائم کی جائیں۔

ہدایات برائے اُساتذہ

- زبان و ادب میں سیرت نگاری کی روایت کا تعارف کروایا جائے۔
- سیرت النبی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی روشنی میں اخلاقیات کی وضاحت کی جائے۔
- سیرت نگاری پر لکھی گئی چند کتابوں کے نام بتائے جائیں؟

2 قومی اتفاق

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- عبارت پڑھ کر بات کے لب لباب کا پورا ادراک کر سکیں، خواہ وہ بات اشارات اور اہم نکات کی صورت میں بیان ہو رہی ہو۔
- مرکب ناقص اور مرکب تام میں تفریق کر سکیں۔
- کسی تحریر یا تقریر کا مرکزی خیال موزوں الفاظ میں مختصر طور پر بیان کر سکیں۔
- اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی روشنی میں مضمون نویسی کی صنف سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

پڑھیں

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے، جس کی ابتدا تاریخی زمانے سے بھی بالاتر ہے، قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم فداہ بابی انت وامّی) نے اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی، بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔

اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا، وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں، وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا، بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم ہو گیا۔

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں، مگر مثل برادرانِ یوسف کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت، یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بُغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔ شیطان، جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ

ترجمہ: ''میں ضرور ان کو تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر رہوں گا''

ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے، جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر دھوکے میں آ گئے، اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آ جاتے ہیں اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے، ایک مقدس لباس پہناتے ہیں۔

باایں ہمہ فروعی مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے اور اس رشتۂ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا تھا، چھوڑا ہے۔ جس قصبے اور شہر میں جاؤ، آپس میں نفاق وعداوت پاؤ گے۔

ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی، قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت ونفاق کو یکتائی ویک جہتی سے مبدّل کریں۔

یکتائی ویک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہو جائیں، یہ امر تو قانون قدرت کے برخلاف ہے، جو ہو نہیں سکتا۔ نہ تو پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔

اتفاق کے قائم رکھنے کی، جس کی ہم کو ضرورت ہے، ایک اور عقلی ونقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر الفاظ میں یوں کہوں کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ ہم کو کسی شخص سے، جب کہ وہ خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت ومخالفت رکھنی نہیں چاہیے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے قائم رکھنا چاہیے۔

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں، جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر ونقصان نہیں۔ جو حصہ کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے اور وہ حصہ آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے، جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے، جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمے میں، جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنا دیا ہے، شریک نہیں ہیں۔ مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔

تمام امورِ انسانیت میں جو تمدن ومعاشرت سے تعلق رکھتے ہیں، ایک دوسرے کے مددگار رہوں۔ آپس میں سچّی محبت، سچّی دوستی اور دوستانہ بردباری رکھو۔

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص، اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے۔ وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے یا مہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔

بعض قابل ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور اُن کے اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جائے گی جس میں باہم

2۔ قومی اتفاق

حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں! یہ بات سچ ہے، مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے، بلکہ قومی اتفاق ہے! ہمارے آپس میں بمقتضائے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو، جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ یا قومی برائی کا اثر تمام قوم کے لوگوں پر پہنچتا ہے، اس لیے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔

اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مدِ نظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں! ان میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالی شان مسجدیں، کیسے کیسے عالی شان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی ہر شہر اور ہر قصبے میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیرات کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھلاتے ہیں، حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں، مسجدیں بنواتے ہیں، کوئی ایسا کام جس میں اُن کی دانست میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روز حشر میں ان کو ثواب حاصل ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو درحقیقت یہ سب کام خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں، نہ ابنائے جنس کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے۔ جب تک کہ ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لیے کریں، نہ ثواب آخرت کے لیے۔ اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہو سکتا۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان ثواب کے کاموں کو برا جانتا ہوں یا ان کی کچھ حقارت کرتا ہوں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی کو ذہن نشین کرنے میں کوشش کروں اور دوسرے کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو بتلاؤں۔

(مقالاتِ سرسید: حصہ پنجم)

سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء)

سرسیّد احمد خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد متّقی تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ان کے والد مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ ابتدا میں یہ بھی مغلیہ دربار سے متعلق ہوئے لیکن بعد میں انگریز حکومت میں ملازمت کر لی اور ترقی کر کے منصف کے عہدے پر پہنچ گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی اور مسلمان قوم کے زوال نے انھیں بہت متاثر کیا، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی بہتری اور اصلاح کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں میں جدید علوم اور سائنس کے فروغ کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں انگریزی طرز کے سکول کی بنیاد رکھی جسے بعد میں کالج اور پھر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ ان کے اہم کارناموں میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہے۔

وہ اپنے خیالات مسلمانوں کے وسیع طبقات تک پہنچانا چاہتے تھے، جس کے لیے انھوں نے صاف، سادہ اور عام فہم اُسلوب میں مضامین لکھے جن میں بے تکلفی کے ساتھ اصلاحی اور اخلاقی موضوعات پیش کیے۔ ان کی اہم کتابوں میں: **آثار الصنادید**، رسالہ **اسبابِ بغاوتِ ہند**، **قرآنِ مجید کی تفسیر** اور **خطباتِ احمدیہ** وغیرہ شامل ہیں۔ سرسیّد احمد خان کی تحریروں سے اُردو زبان اور جدید ادب کو فروغ حاصل ہوا۔

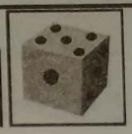

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

الف۔ سرسید کے نزدیک اسلام نے قوم کا کیا تصور پیش کیا ہے؟

ب۔ سرسید نے مسلمانوں کی کن باتوں پر افسوس ظاہر کیا ہے؟

ج۔ قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ کیا ہے؟

د۔ بقول سرسید انسان کی ہستی میں کون سے دو حصے شامل ہیں؟

و۔ مصنف کے نزدیک قومی ہمدردی کن باتوں کا مجموعہ ہے؟

ہ۔ ہماری قوم کے تنزل کا سب سے بڑا سبب کیا ہے؟

ء۔ قومی ہمدردی کا جوش کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟

ی۔ اس سبق کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۲۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں:

حبل المتین　　نیست و نابود　　عروۃ الوثقیٰ　　ابنائے جنس　　مقتضائے بشریت　　نسیاً منسیاً　　جلبِ منفعت

دفعِ مضرت　　تنزل

۳۔ درست الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(پابندی۔ بندش۔ مضبوطی)

الف۔ ہماری قوم نے اس حبل المتین کی _____ کو توڑا ہے۔

(مبدّل۔ تبدیل۔ ختم)

ب۔ عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے _____ کریں۔

(قومی۔ دینی۔ وطنی)

ج۔ روحانی بھائیوں کے علاوہ اور بھی ہمارے _____ بھائی ہیں۔

(اتحاد۔ اتفاق۔ انتظام)

د۔ مہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب _____ کی بدولت ہے۔

(قوم۔ مذہب۔ انسان)

ہ۔ جو کام ہم کریں وہ _____ کے لیے کریں۔

۴۔ سبق کے متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست بیان پر (✓) کا نشان لگائیں تاکہ جملہ مکمل ہو جائے:

۱۔ سبق قومی اتفاق صنفِ ادب کے اعتبار سے کیا ہے؟

الف۔ افسانہ　　ب۔ ناول　　ج۔ ڈراما　　د۔ مضمون

۲۔ سبق قومی اتفاق مقالاتِ سرسید کی کس جلد سے لیا گیا ہے؟

الف۔ اول　　ب۔ دوم　　ج۔ چہارم　　د۔ پنجم

۳۔ سرسید احمد خان کے مطابق ہماری قوم سے کس کی برکت جاتی رہی ہے؟

الف۔ مذہب کی　　ب۔ اتحاد کی　　ج۔ جمعیت کی　　د۔ خوش حالی کی

۴۔ سرسید احمد خان نے کون سا علمی ادبی رسالہ جاری کیا تھا؟

الف۔ فنون　　ب۔ ماہِ نو　　ج۔ اوراق　　د۔ تہذیب الاخلاق ✓

۵۔ درج ذیل الفاظ کے جمع لکھیں:

اتفاق (اتفاقات)	ملک (ممالک)	شیطان	برکت (برکات)	مرحلہ (مراحل)	مقصد (مقاصد)	حصہ (حصص)
امر (امور)	دلیل (دلائل)	غرض (اغراض)	مطلب (مطالب)			

سرگرمی

۶۔ جب دو یا دو سے زیادہ کلمات ترکیب پائیں تو اسے کلام کہتے ہیں۔ کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ناقص اور تام۔ کلام ناقص وہ مرکب ہے جس سے سننے والے کو پورا فائدہ حاصل نہ ہو اور بات نامکمل رہے۔ مثلاً زید کی کتاب۔ خالد کا سبق۔ ان کلمات سے سننے والے تک مکمل بات نہیں پہنچتی اور وہ مزید کسی بیان کا منتظر رہتا ہے۔ ایسے کلام کو مرکب ناقص کہتے ہیں۔

کلام تام وہ مرکب ہے جس سے سننے والے کو پورا فائدہ حاصل ہو۔ اسے مرکبِ مفید یا جملہ بھی کہا جاتا ہے جیسے:

زید کی کتاب میز پر ہے۔ خالد کا سبق ادھورا رہ گیا۔

چنانچہ مرکبِ ناقص میں بات نامکمل رہتی ہے جب کہ مرکبِ تام میں بات مکمل ہوتی ہے۔ آپ اپنے استاد صاحب کی مدد سے اس سبق میں سے مرکبِ ناقص کی چند مثالیں تلاش کریں۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے پہلے مصنف کا تعارف کرایا جائے۔
- سبق کے مرکزی خیال کی وضاحت کی جائے۔
- مصنف کے بعض دیگر مضامین کا حوالہ دے کر بتایا جائے کہ وہ کن اصلاحی مقاصد کو پورا کرنا چاہتا ہے۔
- مصنف کی زبان اور اسلوب پر روشنی ڈالی جائے۔

3

غالبؔ کا اچھوتا پن

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کسی تحریر خاص طور پر علمی، تنقیدی مضمون کی فکری و معنوی خوبیوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
- ادبی اور علمی تحریروں میں مجازی اور اصطلاحی امتیاز کو ملحوظ رکھ کر حسنِ بیان کے تصورات کے بیان کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔
- مرکب تام کے مختلف حصّوں کے بارے میں جان سکیں اور اپنی تحریر اور بیان میں صحیح طور پر استعمال کر سکیں۔
- خود کوئی علمی اور ادبی مضمون کم از کم تین پیراگراف میں تحریر کر سکیں۔

پڑھیں

میرؔ و سوداؔ اور اُن کے مقلّدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں سے اوّلاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں، وہی مضامین، اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرّہ میں ادا کیے جائیں۔ چنانچہ میرؔ سے لے کر ذوقؔ تک جتنے مشہور غزل گو، میرزا غالب کے سوا، اہلِ زبان میں گزرے ہیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے، جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں، جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مَس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں، جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں، جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے تو اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِ مو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی، اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اوّل شاہراہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا، تو ان کو بھی آ کر اسی رُخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اس کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میرؔ و سوداؔ اور ان کے مقلّدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک دُوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح ایک خشکی کا سیّاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں، جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا!

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ یہ جہاں تک کہ معلوم ہے، ایک نیا خیال ہے اور نِرا خیال ہی نہیں، بلکہ فیکٹ[1] ہے کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام دیتا ہے، اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے، اس قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

؎ توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے، تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمّتِ عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت، جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی، تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا، حاصل نہ ہوتا ؎

؎ حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز!
دعا قبول ہو، یا رب کہ عمرِ خضر دراز

چوں کہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اُردو روز مرّہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے مگر بالکل ایک نئی شوخی، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی، کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار آپ یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو، یعنی ایسی چیز طلب کریں گے، جو پہلے ہی دی جا چکی ہو

؎ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے، جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہ کا حساب نہ مانگ اور درپردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیوں کر دوں۔ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں، تو وہ داغ جو تُو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں، جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے مراد یہ رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی، مثلاً پس جتنے گناہ کیے ہیں، اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

؎ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی، مرے خدا نے، مری بے کسی کی شرم

پردیس میں مرنا، جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اُس پر خدا کا اس لیے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑا رہے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیوں کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رُتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غم خوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی، سخت رُسوائی اور ذلّت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شُکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے، جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

---

[1] Fact۔ بمعنی حقیقت

؎ ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا، عجیب اتّفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا، یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دِقّت نہ تھی، کیوں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چُھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں، اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

؎ وفاداری بشرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بُت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے کیوں کہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

؎ دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات مونھ سے نکلے، وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شُبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

؎ رہا آباد عالم، اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مے خانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچُھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمّت کا وجود ہوتا، جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے، تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمّت مفقود ہیں۔ اسی طرح عالم کا آباد ہونا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہلِ ہمّت معدوم ہیں۔

؎ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں، اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے، تو جو گناہ نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی، ان کی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جِدّتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔

(یادگارِ غالبؔ)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ، پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۷ سال کی عمر میں دہلی چلے گئے، جہاں تحصیلِ علم اور مشقِ سخن میں مشغول ہوئے۔ سر سیّد کے رفقائے کار میں وہ اس لحاظ سے نمایاں ہیں کہ انھوں نے قومی اور اصلاحی کاموں میں شرکت کی اور شاعری اور نثر دونوں میں تبدیلی کا عمل سرانجام دیا۔

اُردو نثر میں حالی نے جدید سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی اور **حیاتِ جاوید**، **حیاتِ سعدی** اور **یادگارِ غالب** جیسی کتابیں تحریر کیں۔ اردو تنقید میں بھی انھیں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ **مقدمہ شعر و شاعری** اصولِ تنقید پر اُردو میں پہلی کتاب ہے۔

حالی کا اُسلوبِ تحریر سادہ، ٹھوس اور مدلّل ہے۔ انھوں نے اردو نثر کو سوانحی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے مالا مال کیا۔ وہ ہر بات کو سنجیدگی اور عقلیت کی میزان میں پرکھتے ہیں اور براہِ راست اپنے خیالات قاری تک پہنچاتے ہیں۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

الف۔ الطاف حسین حالی کے نزدیک میرؔ و سوداؔ اور اُن کے مقلّدین نے غزل کی بنیاد کس بات پر رکھی؟

ب۔ میرزا غالبؔ کی شاعری میں وہ کون سی بات ہے جو دوسرے شاعروں میں نہیں ہے؟

ج۔ ''میرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے''۔ اس جملے کا مفہوم کیا ہے؟

د۔ میرزا غالبؔ نے یہ کیوں کہا کہ بُت خانے میں مرنے والے برہمن کو کعبے میں دفن کیا جائے؟

ہ۔ سبق کی روشنی میں مرزا غالبؔ کے کلام کی خصوصیات لکھیں:

۲۔ درج ذیل الفاظ کے معانی لکھیں:

مُقلّدین　　اسلوب　　سہل انگاری　　درپردہ　　بعید

۳۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جُملوں میں استعمال کریں:

اسلوب۔　　فیکٹ۔　　درپردہ۔　　بے گور و کفن۔　　مضائقہ۔　　شاذ و نادر

۴۔ سبق کی روشنی میں درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔

ب۔ اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔

ج۔ جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اس کے متوازی اپنے لیے نکالی۔

د۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔

ہ۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو۔

۵۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مرکب تام سے مراد دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے جس سے کہنے والے کا مقصد پورا ہو جائے اور سننے والے کو بات سمجھ میں آ جائے جیسے: احمد آیا۔ محمود نیک ہے۔

مرکب تام دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:　۱۔ مُسند　　۲۔ مسند الیہ

مرکب تام پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک چیز کو دوسرے کے لیے ثابت کیا جاتا ہے۔ ''احمد آیا'' میں ''آیا'' کو احمد کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔ جسے ثابت کیا جائے، مسند اور جس کے لیے ثابت کیا جائے مسند الیہ کہلایا ہے۔ مثلاً ''محمود نیک ہے'' میں نیک مسند اور محمود مسند الیہ ہے۔ مُسند اسم اور فعل ہو سکتا ہے لیکن مسند الیہ ہمیشہ اسم ہوتا ہے۔ آپ اس سبق سے پانچ مرکب تام چُن کر مسند اور مسند الیہ کی نشاندہی کریں۔

۶۔ مضمون ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس میں لکھنے والا اپنے ذاتی خیالات، احساسات، معلومات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ مضامین اسلوب کے اعتبار سے تخلیقی، تحقیقی یا شگفتہ ہو سکتے ہیں۔ مضامین موضوعات پر لکھے جاتے ہیں اور ان میں موضوع کی نوعیت پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں:

۱۔ تمہید ۲۔ نفسِ مضمون ۳۔ خاتمہ۔ ان میں سے ہر ایک پیرا لکھیں تو تین پیرا کا مضمون بنتا ہے۔

تمہید موضوع کے بارے میں ابتدائی تعارفی جملوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ نفسِ مضمون میں موضوع کے بارے میں جملہ خیالات اور معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ خاتمے میں مضمون کے موضوع کے بارے میں اختصار کے ساتھ نتائج بیان کیے جاتے ہیں۔ مضمون کا ایک عنوان قائم کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کی عنوانات کے ساتھ نشاندہی کریں اور ان میں سے کسی ایک کے نفسِ مضمون کو تین فقروں میں بیان کریں۔

سرگرمی

مضمون لکھنے میں آسانی کے لیے مضمون کے عنوان کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا خاکہ پہلے تیار کیا جاتا ہے جو مضمون کے اہم نکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں کم سے کم تین حصے ہوتے ہیں درمیانی حصے میں وہ نکات بیان ہوتے ہیں، جن پر بات کی جاتی ہے۔ آخری حصے میں ان کا خلاصہ، لب لباب، نتیجہ یا حکم درج ہوتا ہے اور آغاز میں موضوع کا تعارف اس طرح سے کرایا جاتا ہے کہ اگلا یعنی درمیانی حصہ پڑھنے کی طلب پیدا ہو۔ اپنے استاد کی رہنمائی میں ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت پر مضمون کا خاکہ تیار کریں اور پھر اس کے مطابق مضمون لکھیں۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

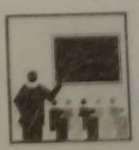

- سبق میں بیان کی گئی شعری اصطلاحات کی وضاحت کی جائے۔
- غالب کے شاعرانہ مقام کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں کہ وہ کس طرح اپنے ہم عصر شعراء سے ممتاز ہیں؟
- شعر کی تشریح کا طریقہ اس مضمون کے حوالے سے طلبہ کو ذہن نشین کروائیں۔
- مضمون نگاری کی مشق کرائیں۔

4 شاعروں کی باتیں

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- ادبی دُنیا کی لطیف پیرائے میں بیان کی گئی باتیں پڑھ کر سمجھ سکیں۔
- روزمرہ زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو عام فہم انداز میں مضامین اور یاداشت کی صورت میں پیش کر سکیں۔
- مرکب تام کی مزید قسموں سے واقف ہو سکیں نیز جملہ انشائیہ اور جملہ خبریہ کے مابین تفریق سے اُنھیں بخوبی اپنی گفتگو اور تحریر میں درست طور پر استعمال کر سکیں۔

پڑھیں

(۱)

خواجہ صاحب (میر درد) کو نوکری کرنے یا دہلی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ دربارِ شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی تھیں۔ امیر غریب خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کے ہاں آنا چاہا اور انھوں نے قبول نہ کیا مگر ماہ بماہ ایک معمولی جلسہ اہلِ تصوّف کا ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے۔ اتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا، اس لیے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ انھوں نے کہا: "یہ امر، فقیر کے آداب کے خلاف ہے"۔ بادشاہ نے عُذر کیا کہ معاف کیجیے، عارضے سے معذور ہوں۔ انھوں نے کہا کہ عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی؟

(۲)

ایک دن [سیّد انشا] نواب سعادت علی خاں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ مُنڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چُہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا: "سبحان اللہ! بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے، وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے"۔

(۳)

خواجہ [حیدر علی آتش] کے ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنی آزادہ مزاجی سے کہا کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے؟ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خدا دیتا ہے، اس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا کہ حضرت! رُخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا: "خیر باشد، کہاں؟ انھوں نے کہا: "کل بنارس کو روانہ ہوں گے۔ کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجیے"۔ آپ ہنس کر بولے: "اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہ دینا"۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت! یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جُدا ہے؟ فرمایا کہ شاید یہاں کا خُدا بخیل ہے، وہاں کا کچھ سخی ہو۔ انھوں نے کہا "معاذ اللہ! آپ کے فرمانے کی یہ بات ہے؟" خواجہ صاحب نے کہا کہ بھلا سنو تو سہی، جب خُدا وہاں یہاں ایک ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو۔ جس طرح اس سے وہاں جا کر مانگو گے، اسی طرح یہاں مانگو، جو وہاں دے گا تو یہاں بھی دے گا۔ اس بات نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمعی سے بیٹھ گئے۔

(۴)

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ [بہادر شاہ ظفر] قطب میں تھے۔ یہ [استاد ذوق] ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے

ع شب کو میں اپنے سرِ بستر خوابِ راحت

چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انھیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس بیٹھتی تھیں۔ یہ، عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی، انھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی، انھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے، عالم ہے، حافظ ہے۔ ابھی "اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ"[1] کی آیت پڑھ کر "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا"[2]، "بِسْمِ اللہ اللہ اَکْبَرْ"[3] کر دے گا۔ دیوانی ہے، جو تمھارے سر پر آئے؟

(۵)

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو، دہلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامس صاحب جو کئی سال تک اضلاعِ شمال و مغرب کے لیفٹیننٹ گورنر[4] بھی رہے، اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرّسین کے امتحان کے لیے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیا مہینے کا ایک مدرّس عربی ہے، ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ اُن میں میرزا [غالب] کا نام بھی آیا۔ میرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسبِ دستورِ قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ اُدھر سے آئے نہ یہ اِدھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے؟ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیوں کر جاتا؟ جمعدار نے جا کر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا: "جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہو گی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اس تعظیم کے مستحق نہیں"۔ میرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں، نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ میرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔

(۶)

ایک دن میرزا [غالب] کے ایک شاگردِ رشید نے آ کر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھُل گیا۔ دیکھیے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ میرزا نے کہا کہ ارے میاں! تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

(آبِ حیات)

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

1۔ ترجمہ: "تمھارے لیے شکار کا حلال کیا گیا" (سورۃ المائدہ، آیت: ۹۶)

2۔ ترجمہ: "کھاؤ اور پیو۔" (سورۃ البقرۃ، آیت: ۶۰)

3۔ یہ الفاظ جانور ذبح کرتے وقت پڑھے جاتے ہیں، جن کو "تکبیر" کہتے ہیں۔

4۔ Lieutenant Governor

مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزادؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا جو انیسویں صدی کی اردو صحافت میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ آزاد نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ انھیں شعر و ادب کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ شاعری میں استاد ابراہیم ذوقؔ کی شاگردی اختیار کی۔ انھیں بہت مشکل حالات میں دہلی چھوڑنا پڑی۔ وہاں سے لاہور پہنچے، جہاں کئی جگہ ملازمت کی۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اُستاد مقرّر ہوئے۔ زندگی کے آخری بیس سال بیماری کی حالت میں گزارے، اس عالم میں بھی لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا۔

آزادؔ کا نثری اسلوب پُر تکلّف اور رنگین نثر کا شاہکار ہے۔ انھیں اُردو کا ایک منفرد انشاپرداز کہا جاتا ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں **آبِ حیات، سخن دانِ فارس، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال** اور **قصص ہند** وغیرہ شامل ہیں۔ **"نظمِ آزاد"** ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیں:

الف۔ خواجہ میر دردؔ نے بادشاہ کو کس بات پر ٹوکا؟

ب۔ سید انشاؔ کے دستار اُتارنے پر نواب سعادت علی خاں نے کیا شرارت کی؟

ج۔ آتشؔ کے واقعہ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

د۔ استاد ذوقؔ نے حافظ ویرانؔ کی کس بات پر طنز کی ہے؟

ہ۔ غالبؔ اس بات پر کیوں مُصر تھے کہ دہلی کالج میں ان کا استقبال کیا جائے؟

۲۔ درج ذیل الفاظ کو جُملوں میں استعمال کریں:

دیوان　　عارضہ　　دو گھڑی　　اعزاز　　سعادت

۳۔ صحیح جواب کی نشاندہی (✓) سے کریں:

۱۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ اپنے شاگرد سے کہا کرتے تھے۔

الف۔ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خُدا دیتا ہے، اس پر صبر کرو۔　　ب۔ دو گھڑی اکٹھے بیٹھنے کو زندگی کا سرمایہ سمجھو۔

ج۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت کرو۔　　د۔ زندگی میں ایسا کام کرو کہ لوگ یاد رکھیں۔

۲۔ نواب نے سید انشاؔ کے سر پر دھول ماری تو انھوں نے

الف۔ جواب میں نواب کو دھول ماردی۔　　ب۔ نواب کو بُرا بھلا کہا۔

ج۔ جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی۔　　د۔ ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

۳۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد کس کی شکایت کر کے سفر کا ارادہ کیا کرتے تھے؟

الف۔ قسمت کا　　ب۔ بے روزگاری کا　　ج۔ غربت کا　　د۔ حالات کا

۴۔ سبق شاعروں کی باتیں کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

الف۔ نیرنگِ خیال　　ب۔ قصصِ ہند　　ج۔ آبِ حیات　　د۔ شعر العجم

۵۔ 1842ء میں حکومتِ انگلشیہ کو کس مضمون کے مدرس کی ضرورت تھی؟

الف۔ فارسی ب۔ عربی ج۔ انگریزی د۔ پنجابی

۶۔ فارسی کے مدرس کے لیے کس عظیم شاعر کا نام نکلا؟

الف۔ مومن خان مومن ب۔ میرزا غالب ج۔ خواجہ ابراہیم ذوق د۔ امام بخش ناسخ

۷۔ ایک دن میرزا غالب کا شاگرد کس کی قبر پر گیا؟

الف۔ شاہ ولی اللہ ب۔ بہادر شاہ ظفر ج۔ خواجہ نظام الدین اولیا د۔ امیر خسرو

۸۔ غالب کے شاگرد نے امیر خسرو کی قبر پر جا کر کیا کھایا؟

الف۔ پپلیاں ب۔ آم ج۔ کھرنیاں د۔ سنگترے

۴۔ اس سبق میں جن شاعروں کا ذکر آیا ہے اُن کے نام ترتیب وار لکھیں۔

۵۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ یہ اَمر فقیر کے آداب کے خلاف ہے۔

ب۔ شاید یہاں کا خدا بخیل ہے، وہاں کا کچھ سخی ہو۔

ج۔ اس غیبانی نے میرے سَر کو کبوتروں کی چھتری بنا دیا ہے۔

د۔ میرے پچھواڑے کی پپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

۶۔ مرکب تام کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اس میں بات مکمل ہوتی ہے اور سننے والے کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مرکب تام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جملہ انشائیہ ۲۔ جملہ خبریہ

جملہ انشائیہ وہ جملہ ہے جس میں فعل امر، فعل نہی، سوال، ندا، تمنا پائی جائے جیسے: تو سبق پڑھ، حامد شرارت نہ کر، کیا فراز نے کتاب پڑھی۔ اے اللہ رحم کر۔ کاش میں محنت کرتا۔ یہ تمام جملے انشائیہ ہیں۔

جملہ خبریہ وہ جملہ ہے جس میں کسی بات کی خبر دی جائے اور اس جملے کے بولنے والے کو جھوٹا یا سچا کہہ سکیں۔

آپ اس سبق میں سے پانچ انشائیہ جملے چُن کر اس بات کی نشاندہی کریں کہ ان میں فعل کی کون سی صورت پائی جاتی ہے۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے قبل طنز اور مزاح کا الگ الگ تعارف کرایا جائے اور ان دونوں کا فرق واضح کیا جائے۔
- ہر شاعر سے منسوب واقعہ بیان کرتے ہوئے شاعر کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں۔
- مولانا محمد حسین آزاد عام طور پر پُر تکلف اسلوب اختیار کرتے ہیں لیکن اس سبق میں انھوں نے نسبتاً سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کی نثر کی دونوں مثالیں سامنے رکھ کر وضاحت کی جائے۔

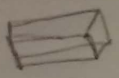

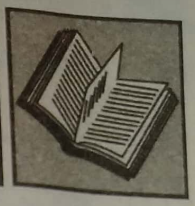

5 توبتہُ النَّصُوح

(تعارف و تلخیص)

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- کسی ادب پارے خاص طور پر ناول کا مرکزی خیال سمجھ کر پڑھ سکیں۔
- مرکزی خیال کے حوالے سے کسی عبارت کی تشریح کر سکیں۔
- ناول کے اقتباس یا ادب پارے کا خلاصہ کر سکیں۔
- مکالمے کے بارے میں مزید جان سکیں اور روزمرہ زندگی کے تجربات، مشاہدات، معمولات کے حوالے سے مکالمہ تحریر کر سکیں۔

پڑھیں

برسوں پہلے دہلی میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی، جس سے روزانہ لوگ مرنے لگے۔ ہر طرف ویرانی اور پریشانی پھیل گئی۔ بازار اُجڑ گئے۔ وبا سے متاثر ہونے والے لوگوں میں ایک متوسط گھرانے کا فرد نصوح بھی تھا۔ شدید بیماری کی حالت میں اس نے خواب دیکھا کہ ایک عدالت میں اعمال اور جزا سزا کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ نصوح نے ڈپٹی مجسٹریٹ کے طور پر ایسی زندگی گزاری تھی، جس میں حلال و حرام کی تمیز نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی اور گھر کے طور طریقوں پر نظر ڈالی تو احساسِ ندامت اور خوفِ خدا پیدا ہوا۔ لہٰذا اس نے خود کو تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔

خدا نے اسے صحت عطا کر دی تو پہلے اس نے اپنا محاسبہ کیا اور تمام برائیوں سے تائب ہو کر زندگی کو دین اور شریعت کے مطابق ڈھال لیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی فہمیدہ کو اپنا ہم خیال بنایا اور دونوں میاں بیوی نے مل کر گھر کی اصلاح کرنے کا فیصلہ کیا۔

نصوح کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے جب اپنے بچوں کی مصروفیات اور دلچسپیوں کا جائزہ لیا تو بڑے بیٹے کلیم اور دونوں بیٹیوں کی طرف سے خاصا مایوس ہوا۔ کلیم جدید تہذیب و تمدن میں ڈھل کر دین اور اخلاقیات سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ نوابوں کی طرح تھے اور وہ خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ہی جیسے دوستوں کی صحبت میں خوش رہتا تھا، جن میں ایک ظاہر دار بیگ بھی تھا جو اپنے نام کی طرح اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ تھا۔

نصوح کی دونوں بیٹیاں نعیمہ اور حمیدہ بھی خاصی بگڑی ہوئی تھیں۔ بڑی بیٹی نعیمہ کی شادی ہو چکی تھی لیکن سسرال والوں سے لڑائی کے بعد ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ حمیدہ بھی کوئی کام سلیقے سے نہ کرتی تھی۔ نصوح کے سمجھانے پر دونوں بیٹیاں تو کسی نہ کسی طرح صحیح راستے پر آ گئیں اور انھوں نے اپنے طور طریقے درست کر لیے لیکن کلیم کسی طرح بھی نہ سُدھر سکا اور اس کا انجام بہت بُرا ہوا۔

نصوح کا منجھلا بیٹا علیم اور چھوٹا بیٹا سلیم اتفاقیہ طور پر نیک، شریف اور دین دار نکلے۔ اس کی وجہ حضرت بی جیسی نیک خاتون تھیں جنھوں نے علیم اور سلیم کے ساتھ محلّے کے بے شمار بچوں کی تربیت کی اور انھیں اچھی اچھی باتیں سکھا کر سیدھے راستے پر لگا دیا۔

نصوح نے جب اپنے بچوں کے احوال کا جائزہ لیا تو اس نے دیگر بچوں کے علاوہ اپنے چھوٹے بیٹے سلیم سے بھی گفتگو کی۔ ذیل میں ناول کا وہ حصّہ پیش کیا جا رہا ہے، جس میں والد کے پوچھنے پر سلیم انھیں اپنی مصروفیات کا حال بتاتا ہے:

نصوح اور سلیم کی گفتگو

اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آ جگایا کہ صاحبزادے اٹھیے، بالا خانے پر میاں بلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سنی، گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ہاتھ مونھ دھو، ماں سے آ کر پوچھنے لگا: ''اماں جان! تم کو معلوم ہے۔ ابا جان نے کیوں بلایا ہے''؟

ماں: بھائی مجھ کو تو کچھ خبر نہیں ہے۔ ہاں! ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اترے۔

سلیم: بیدارا! تجھ کو کچھ معلوم ہے؟

بیدارا: میاں! میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی، میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ ان کو بھیج دیجیو۔

سلیم: صورت سے کچھ غصّہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا؟

بیدارا: نہیں تو۔

سلیم: تو اماں جان! ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔

ماں: میری گود میں لڑکی سوتی ہے، تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟

سلیم: کچھ پوچھیں گے؟

ماں: جو کچھ پوچھیں گے، تم اس کا معقول طور پر جواب دینا۔

غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اُوپر گیا اور سلام کر کے الگ جا کر کھڑا ہوا۔ باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا:۔ ''کیوں صاحب! ابھی مدرسے نہیں گئے؟''

بیٹا: جی بس جاتا ہوں۔ ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے۔

باپ: تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ؟

بیٹا: کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں۔

باپ: کیوں؟

بیٹا: اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے، چھوٹے بھائی جان اسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں، وہاں ان کو دیر ہو جاتی ہے تو پھر گھر نہیں جاتے، میں جاتا ہوں تو ان کو مدرسے میں پاتا ہوں۔

باپ: کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے کہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں؟

بیٹا: جگہ تو ہے، مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہُوا کرتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا۔

باپ: تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو؟

بیٹا: مہرے پہچانتا ہوں، چالیں جانتا ہوں مگر کبھی خود کھیلنے کا اتّفاق نہیں ہُوا۔

باپ: مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے۔

بیٹا: شاید مجھ کو عمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئے۔

باپ: کیوں کیا ایسی مشکل ہے؟

بیٹا: مشکل ہو یا نہ ہو، میرا جی ہی نہیں لگتا۔

باپ: سبب؟

بیٹا: میں پسند نہیں کرتا۔

باپ: چوں کہ مشکل ہے۔ اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ گنجفے میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہو گی۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے۔

بیٹا: میں شطرنج کی نسبت گنجفے کو زیادہ تر ناپسند کرتا ہوں۔

باپ: ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفے میں حافظے پر۔

بیٹا: میری ناپسندیدگی کا کچھ خاص کر یہی سبب نہیں ہے۔ بلکہ مجھ کو سارے کھیل بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

باپ: تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں کیونکہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا، میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا۔

بیٹا: آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا۔ مگر اب تو مجھ کو یک دلی نفرت ہو گئی ہے۔

باپ: آخر کوئی اس کا خاص سبب ہو گا؟

بیٹا: آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہو گا۔

باپ: وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔

بیٹا: ہاں جناب وہی چار لڑکے۔

باپ: پھر؟

بیٹا: بھلا آپ نے کبھی ان کو کسی قسم کی شرارت کرتے بھی دیکھا ہے؟

باپ: کبھی نہیں۔

بیٹا: جناب! کچھ عجب عادت ان لڑکوں کی ہے۔ راہ میں چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے۔ اپنے سے بڑا مل جائے، جان پہچان ہو یا نہ ہو، ان کو سلام کر لینا ضرور۔ کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں، مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں لیکن ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں۔ نہ کبھی لڑتے ہیں نہ جھگڑتے، نہ گالی بکتے، نہ قسم کھاتے، نہ جھوٹ بولتے، نہ کسی کو چھیڑتے، نہ کسی پر آوازہ کستے۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں بھی ان کا یہی حال ہے، کبھی کسی نے ان کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے، لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔

باپ: بھلا پھر؟

بیٹا: منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے۔ ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا، مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ کم بخت! گھر سے گھر ملا ہے، اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر۔ میں نے جو پوچھا، کیوں صاحب یاد کروا دیا کرو گے تو کہا، بسر و چشم۔ غرض میں اگلے دن ان کے گھر گیا، آواز دی۔ انھوں نے مجھ کو اندر بلا لیا۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے قبلہ رُو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں، لوگ ان کو حضرت بی کہتے ہیں۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا۔ جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ

ہوئیں، تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا! گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضروری ہے کہ میں تم کو دُعا دوں، جیتے رہو، عمر دراز، خدا نیک ہدایت دے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً اُٹھ کر میں نے نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا بُرا مت ماننا۔ یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں۔ میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن چوں کہ تم میرے بچوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو، اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا۔ اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی۔ مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا۔ حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں اور مجھ کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں۔ تبھی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹّا ہو گیا۔

باپ: یہ تو تم نے اچھا اختصار کیا۔ جی سب باتیں مجھ کو سناؤ۔ کیا کیا تم سے حضرت بی نے کہا۔

بیٹا: ہر روز آنے جانے سے میں ان لوگوں کے ساتھ خوب بے تکلّف ہو گیا مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا۔ پھر کوئی گرفت نہیں کی۔ باوجودیکہ میں شوخی بھی کرتا تھا لیکن وہ خفا نہیں ہوتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے ایک ہمسائے کے لڑکے سے باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے عین انھیں کے دروازے پر لڑائی ہو پڑی۔ سخت کلامی کے بعد گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔ پھر مار کٹائی ہونے لگی۔ لڑکا مجھ سے کمزور تھا۔ ذرا اڑنگے پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں، چاروں شانے چت۔ پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچّے کو ایسے گھونسے دیے کہ یاد ہی کیے ہوں گے۔ اگر لوگ چھڑا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ موا ہی کر دیتا۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اس پر سے اتارا اور ایک دو نے میری پیٹھ بھی ٹھونکی کہ شاباش پٹھّے شاباش! لیکن وہ لڑکا ایسا چنیدر باز تھا کہ پھر خم ٹھونک کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ جاؤں، اتنے میں اندر سے اسی میرے ہم جماعت نے آواز دی اور ادھر لوگوں نے کہا: میاں! جانے دو۔ یہ تمہارے جوڑ کا نہیں۔ غرض میں اندر چلا گیا۔ میرے ہم جماعت نے پوچھا کہ کیوں جی کس سے لڑ رہے تھے؟ میں نے کہا: میاں یہی کنجڑے والا رمضانی، کمزور، مار کھانے کی نشانی، لیکن خدا کی قسم! میں نے بھی آج اس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کرے گا۔ اس وقت تک غصہ اور طیش تو فرو ہوا ہی نہ تھا۔ نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سن کر آنکھیں نیچی کر لیں اور بڑی دیر تک سرنگوں بیٹھے رہے۔ آخر حضرت بی بولیں کہ سلیم! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو ایسا پیارا لڑکا اور گُن تیرے ایسے خراب۔ اس مونھ سے ایسی باتیں، آج کئی دن سے میں تم کو سمجھانے والی تھی مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سنی، مجھ کو یقین ہو گیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود ہے۔ بڑا رنج تو مجھ کو اس بات کا ہے کہ تو ہاتھ سے گیا گزرا ہوا، دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ تیری خُو بُو کا ایک شمّہ انھوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے جیتے جی مر لے، ملنا جُلنا تو بڑی بات ہے۔ اب یہ محلہ مجھ کو چھوڑنا پڑا، اتنی بے حیائی ایسی بدزبانی، اوّل تو لڑنا اور پھر گلی کوچے میں اور اس پر ایسی موٹی موٹی گالیاں۔

میں: جناب! خدا کی قسم! ہرگز میں نے پہل نہیں کی، وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا۔

حضرت بی: بس اپنی قسموں کو بند کرو۔ میں قسم اور گالی دونوں کو برابر سمجھتی ہوں۔ جس کو بے موقع، بے محل خدا کا نام لینے میں باک نہیں، اس کو کسی بات کے بک دینے میں تامل نہیں۔

میں: گالی بھی پہلے اس نے مجھ کو دی۔

حضرت بی: تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی؟

میں: یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا۔

حضرت بی: کیا ایسے بے ہودہ لڑکوں سے ملاقات رکھنا تمھارا قصور نہیں ہے؟

میں: جناب! آپ کو معلوم نہیں، وہ لڑکا راہ چلتوں کے سَر ہوتا ہے۔

حضرت بی: یک نہ شُد دو شُد، دروغ گویم بروئے تو۔ میرے لڑکوں کے تو کوئی بھی سَر نہیں ہوتا۔

میں: ان سے تو سرے سے جان پہچان ہی نہیں۔

حضرت بی: اور تم سے ہے؟

میں: کیوں کر کہوں کہ نہیں ہے؟

حضرت بی: ہے تو وہی تمھارا قصور ہے اور اسی کی یہ سزا ہے کہ تم نے بازار میں گالیاں کھائیں۔

میں: لیکن میں نے بھی خوب ہی بدلا لیا۔

حضرت بی: بس یہی تو تمھاری خرابی کے لچھّن ہیں کہ اس کو تم بدلا سمجھتے ہو۔ اگر ایک شخص تمھارے ساتھ برائی کرے تو اس کو لوگ بُرا کہیں گے؟

میں: ضرور کہیں گے۔

حضرت بی: اور جب تم اس کے ساتھ زیادہ برائی کرو تو کیا زیادہ بُرے نہ کہلاؤ گے۔ گالی بکنا ایک زبُوں بات ہے۔ اس نے بکیں تو جھک مارا اور تم نے زیادہ بکیں تو زیادہ جھک مارا۔ سلیم! تم اپنے میں اور اس کنجڑے کے چھوکرے میں کچھ فرق سمجھتے ہو؟ یہ سن کر مجھ کو ندامت شروع ہوئی اور میں نے کہا کہ واقعی، اس وقت تو مجھ میں اور اس میں کچھ فرق نہ تھا۔

حضرت بی: لیکن وہ ایک بازاری آدمی کا بیٹا ہے اور تم ایک بڑے عزت دار کے لڑکے ہو، تمھارے دادا کا شہر میں وہ شہرہ ہے کہ ان کے نام کی لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ انھیں کے پوتے تم ہو۔ جھوٹ بولنے پر دلیر، قسم کھانے میں بیباک، فحش بکنے میں بے دھڑک۔ سلیم کوئی شخص دین اور دنیا دونوں میں اس وجہ سے عزت نہیں پا سکتا کہ باپ دادے عزت دار تھے۔ آدمی کی عزت اس کی عادت اور مزاج سے ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں عزت حاصل کرنے کی ہیں؟ ہرگز نہیں۔

یہ سُن کر مجھ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا، حضرت بی بھی آبدیدہ ہوئیں اور مجھ کو پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہا کہ بیٹا! میں تمھارے ہی فائدے کے لیے کہتی ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں گیا لیکن چند روز بعد تم کو ان عادتوں کا چھوڑنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہ اگر اب سے آپ مجھ کو قسم کھاتے یا فحش بکتے یا جھوٹ بولتے یا بازاری لڑکوں میں کھیلتے سنیں تو مجھ کو اپنے گھر میں نہ آنے دیجیے گا۔

باپ: کیا بس اسی دن سے تم کو کھیلنے سے نفرت ہو گئی؟

بیٹا: جناب! نہیں۔ مہینوں میں حضرت بی کے یہاں جاتا رہا اور ہر روز نصیحت کی دو چار باتیں وہ مجھ کو بتایا کرتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے مجھ ہی سے میرے وقت کا حساب پوچھا۔ میں نے سونا اور کھانا اور کھیلنا اور تھوڑی دیر لکھنا پڑھنا، بہتیرے کام گنوائے مگر انھوں نے سن کر ایک ایسی آہ کھینچی کہ آج تک اس کی چوٹ میں اپنے دل میں پاتا ہوں اور کہا: سلیم! آٹھ پہر میں خدا کا ایک کام بھی نہیں۔ خدا نے تم کو آدمی بنایا۔ کیا ممکن نہیں تھا کہ وہ تم کو بلّی یا کتّا بنا دیتا۔ پھر آدمی بھی بنایا تو ایسے خاندان کا جو عزت دار اور خوشحال ہے۔ ہو سکتا تھا کہ تم مزدور یا لکڑہارے کے گھر پیدا ہوتے اور ایسی ہی چھوٹی سی عمر میں تم کو پیٹ پورا کرنے کے واسطے محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی سوائے چنے کے اور کچھ نہ پاتے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ ایک لنگوٹی تم باندھے پھرتے، نہ پاؤں میں جوتی، نہ سر پر ٹوپی، نہ گلے میں انگرکھا۔ جہاں جاتے دُر دُر۔ جس کے پاس کھڑے ہوتے پھٹ پھٹ۔ پھر صورت تم کو ایسی پاکیزہ دی کہ جو دیکھے پیار کرے۔ کیا تم کو کالا پھٹ، کانڑا، لنگڑا، کوڑھی بنا دینا اس کو مشکل تھا۔ جس خدا کے تم پر اتنے سلوک اور اتنے احسان ہیں، ستم ہے کہ دن رات میں ایک دفعہ بھی اس کے آگے سر نہ جھکاؤ، غضب ہے کہ ایک لمحہ بھی اس کو یاد نہ کرو۔

تب حضرت بی نے مجھ کو نماز سکھائی، اس کے معنی سمجھائے اور اسی طرح انھوں نے مجھ کو ہزارہا نصیحتیں کیں، کہ برزبان یاد نہیں رہیں، مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

باپ: کیوں تم نے کس لیے ان کے یہاں جانا ترک کیا؟ کیا ان کے نواسوں سے لڑائی ہو گئی؟

بیٹا: جناب! ان کے نواسے مجھ کو بھائیوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ اگر میں ان سے لڑتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ نالائق کوئی نہ تھا۔

باپ: پھر کیا حضرت بی تم سے ناخوش ہو گئیں؟

بیٹا: استغفر اللہ! وہ تو خود اس درجے کی نیک ہیں کہ غصّہ ان کو چھو کر ہی نہیں گیا۔

باپ: تو کیا تم آپ سے بیٹھ رہے؟

بیٹا: میں تو ہر روز وہاں جانے کے لیے تڑپتا ہوں۔

باپ: تو کیا یہاں تم کو کسی نے منع کر دیا؟

بیٹا: نہیں، کسی نے منع بھی نہیں کیا۔

باپ: پھر کیا سبب ہوا؟

بیٹا: اگر آپ مجھ کو اس کا سبب بیان کرنے سے معاف رکھتے تو بہتر تھا۔

باپ: نہیں! ضرور ہے کہ تمھارے نہ جانے کا سبب معلوم کروں۔

بیٹا: اس میں ایک شخص کی شکایت ہو گی اور حضرت بی نے مجھ کو غیبت اور چغلی کی ممانعت کی ہے۔

باپ: لیکن کیا وہاں نہ جانے سے تمھارا نقصان نہیں ہے؟

بیٹا: اے جناب! نقصان سا نقصان ہے، مگر میرے اختیار کی بات نہیں۔

باپ: تو میں تم کو اپنے منصبِ پدری کی رُو سے حکم دیتا ہوں کہ تم سارا حال پوست کندہ بیان کرو۔

بیٹا: حضرت بی نے ایک دفعہ مجھ کو بتاکید کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا ڈالو۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں ان کی خدمت بھی بہت کرتا تھا لیکن چوں کہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات کہتی ہیں ضرور میری منفعت کے واسطے کہتی ہیں، میں نے کہا: بہت خوب۔ حضرت بی نے اور تو کچھ سبب نہیں بیان کیا، مگر اتنا کہا کہ بالوں کی برد گزاشت میں تمھارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو ایسی فضول باتوں میں صرف کیا جائے اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگلے دن جو حجام بڑے بھائی جان کا خط بنانے آیا، میں نے اس سے کہا کہ خلیفہ میرے بال بھی مونڈ دینا۔ بالوں کا مونڈنا سن کر بڑے بھائی جان اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔ مجھ کو جو چاہتے کہ لیتے، حضرت بی اور ان کے نواسوں کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔ یہ کہ کر سلیم کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔

(توبۃ النّصوح)

مولوی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد موضع ریہڑ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ابتدائی تعلیم کچھ مکتب اور کچھ والد سے حاصل کی۔ ۱۴ برس کی عمر میں دہلی آ گئے، اور دہلی کالج میں داخلہ مل گیا جہاں سے عربی ادب، فلسفہ اور ریاضی کے مضامین پڑھے۔ مدرّس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ قانون، انکم ٹیکس اور تعزیراتِ ہند کے اُردو میں ترجمے کیے، جس کے صلے میں تحصیل دار بنا دیے گئے۔ بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ حیدر آباد میں ممبر بورڈ آف ریونیو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

نذیر احمد کو اُردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں دہلی کی صاف اور بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ انھیں کہانی بیان کرنے اور کرداروں کو خاص ڈھب دینے کا ملکہ حاصل ہے، جن میں اصلاح اور سبق آموزی کا پہلو نمایاں ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مافوق الفطرت عناصر کے بجائے حقیقی زندگی کی پہلی مرتبہ عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ناولوں میں **مرأۃ العروس**، **توبۃ النّصوح**، **رویائے صادقہ** اور **ابن الوقت** وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور اصلاحی نقطۂ نظر سے دیگر کتب بھی لکھیں۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

الف۔ سلیم باپ کے سامنے جانے سے کیوں خوف زدہ تھا؟

ب۔ سلیم کو ایک دم تمام کھیلوں سے کیوں نفرت ہو گئی؟

ج۔ حضرت بی نے پہلے پہل سلیم کو کس بات پر ٹوکا؟

د۔ باپ نے سلیم سے ساری بات تفصیل سے بیان کرنے کو کیوں کہا؟

ہ۔ حضرت بی نے کس بات پر سلیم کو قصوروار ٹھہرایا؟

و۔ حضرت بی نے سلیم کی کس بات پر آہ کھینچی؟

ز۔ کس بات پر سلیم کا حضرت بی کے گھر جانا چھوٹ گیا؟

ح۔ بڑے بھائی صاحب سلیم سے کیوں خفا ہوئے؟

۲۔ سبق کے متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست بیان پر (✓) کا نشان لگائیں تاکہ جملہ مکمل ہو جائے:

۱۔ باپ نے سلیم کو اس لیے بلا بھیجا کہ وہ اسے:

الف۔ کوئی کام کہنا چاہتا تھا۔

ب۔ اس کے خلاف شکایت پر پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

ج۔ اس سے سبق سننا چاہتا تھا۔

د۔ اس کے حالات دریافت کرنا چاہتا تھا۔

۲۔ چاروں لڑکے کئی برس سے محلّے میں رہتے ہیں مگر کسی کو:

الف۔ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

ب۔ کانوں کان خبر نہیں۔

ج۔ ان سے شکایت نہیں۔

د۔ ان سے کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر

الف۔ پاندان کھولے بیٹھی تھی۔

ب۔ بچوں کو پڑھا رہی تھی۔

ج۔ عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔

د۔ جائے نماز بچھائے بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھی۔

۴۔ حضرت بی نے سلیم سے کہا کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں:

الف۔ بہت اچھی ہیں۔ ب۔ عزت حاصل کرنے کی نہیں۔

ج۔ تمھیں بہت فائدہ دیں گی۔ د۔ پڑھائی میں کام آئیں گی۔

۳۔ حضرت بی کی شخصیت پر پانچ جملے تحریر کریں۔

۴۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا۔ ب۔ میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا۔ ج۔ ایسا پیارا لڑکا اور گن ایسے خراب۔

د۔ وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا۔ ہ۔ ہزارہا نصیحتیں کیں کہ برزبان یاد نہیں رہیں۔

۵۔ ان محاورات کے معنی بتائیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

کانوں کان خبر نہ ہونا زمین میں گڑ جانا پیٹھ ٹھونکنا غصّہ فرو ہونا آنکھیں نیچی کرنا دل کھٹا ہونا

سرگرمی

مکالمے کے معنی بات چیت یا گفتگو کرنا یا کسی سے ہم کلام ہونا یا سوال و جواب کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں دو آدمیوں کے درمیان بات چیت کا نام مکالمہ ہے۔

مکالمے دو قسم کے ہوتے ہیں؟

۱۔ حقیقی مکالمے ۲۔ فرضی یا خیالی مکالمے

حقیقی مکالمے میں انسان باہم مصروفِ گفتگو ہوتے ہیں جیسے ماں، باپ، بیٹا، دوست، دکاندار، گاہک، ڈاکٹر اور مریض وغیرہ۔ جب کہ فرضی یا خیالی مکالمے میں خیالی یا بے جان اشیا کو ان کے حسبِ حال باہم مصروفِ گفتگو دکھایا جاتا ہے۔ اِس سبق میں مصنّف نے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ آپ اِس سبق کو پیشِ نظر رکھ کر باپ اور بیٹے کے درمیان گفتگو کو اختصار کے ساتھ مکالمے کی صورت میں اپنے الفاظ میں لکھیں۔

ناول نگاری

''ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو یہ دل چسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں''

(ابواللیث صدیقی، اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ)

''ناول کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے زندگی'' **(ممتاز حسین، نئی قدریں)**

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے قبل ناول توبۃ النصوح کے تعارف اور تلخیص کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اہم کرداروں پر روشنی ڈالی جائے اور اُن کے اچھے بُرے انجام کا سبب بتایا جائے۔
- مولوی نذیر احمد کے ناولوں کی خصوصیات بتائی جائیں۔ خاص طور پر ناولوں میں جو مکالمہ نگاری کی جاتی ہے، اس سے آگاہ کریں۔
- مصنف کے اُسلوبِ بیان اور زبان کے بارے میں سادہ الفاظ میں وضاحت کی جائے۔

6 زیور کا ڈبّا

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- کسی کہانی کے افسانے کسی ایک حصے کا انتخاب کر کے بقیہ حصے کو اپنے تخیل کی بنیاد پر مکمل کر سکیں۔
- بطور صنف افسانے کے لوازمات اور اجزاء سے واقف ہو سکیں۔
- جملہ خبریہ کی قسموں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ میں امتیاز کر سکیں۔
- خاص طور پر لازم اور شعری کے حوالے سے فعل، فاعل اور مفعول میں تفریق کر کے اپنی تحریر اور گفتگو میں مناسب الفاظ اور موزوں جملے استعمال کر سکیں۔

پڑھنے سے پہلے

مختصر کہانی یا ایک ہی پہلو یا نکتے، سبق یا نتیجے پر مشتمل کہانی کو افسانے کا نام دیا جاتا ہے۔ منشی پریم چند کے افسانے معاشرے کی ناہمواریوں کے بہت سے پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ لائبریری میں جا کر آپ ان کے اور بھی افسانے پڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ دوسرے افسانہ نگاروں کی تحریریں بھی پڑھیں تو منشی کے افسانے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔ آپ کو کون سا افسانہ نگار زیادہ پسند ہے؟

پڑھیں

(۱)

بی۔اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ اُس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا، وہ مٹّی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری اُمید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی بھی جائداد نہ چھوڑی، الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور عورت بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان طرار، جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس روپے کی نوکری کرتے شرم تو آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ، ہوادار، صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انھی کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا لڑکا ہی سمجھتے تھے، گویا وہ ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملے میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا، پرکاش نے اپنے شاگرد، ویر اندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا "ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے۔"

پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے، جو ویر اندر کے سامنے نہیں کہی جاسکتی! پرکاش کو علاحدہ لے جا کر اومادیوی نے کہا: "تمھاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں، ایک بہت اچھے گھر سے پیغام آیا ہے۔" پرکاش نے مسکرا کر کہا "یہ تو ویرو بابو جی سے پوچھیے۔"

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا "میں اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہوں، ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں تمھاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں، میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے، پھر پچھتانا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"میرے رہتے ہوئے تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے، کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمھیں کرنی پڑیں گی، یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے، پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔ بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھ میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار مینیجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے، کہیں محلے کا بنیا اسے گھیرے ہوئے ہے، کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپیہ آسانی سے اڑا سکتا تھا، لیکن وہ اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے، جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے، اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آ کر چمپا سے بولا: "ہم تم یہاں روٹیوں کے محتاج اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں کا زیور بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔"

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی: "اونھ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے، وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔"

چندر پرکاش: "یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا، باپ دادا چھوڑ گئے ہیں، مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔"

چمپا: "اپنا اپنا مقدر ہے۔ تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرّہ کا خرچ چلانا مشکل ہے، گہنے کپڑے کو کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔

"ساڑھی تمھارے لیے ضرور لاؤں گا، یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی۔"

چمپا مسکرا کر بولی: "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گزر ہوتی جائے، یہی بہت ہے۔"

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ "اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں، مجھے اس کی امید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا: "کوئی اور بات کرو، زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔"

"ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔ ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے، اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے بھی لیتے جاؤ۔"

"تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے؟ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"

"میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"

"میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سود و سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہلِ ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں، پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آئی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ! چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں۔ پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اسی عمر میں اس بیچاری کو ہر چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس کی چھت سے ملی ہوئی، بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا اور ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا "بڑا غضب ہو گیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبا اٹھا کر لے گئے۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا: "یہ تو بڑا غضب ہوا ماتا جی! مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے، بولے: "کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چور آیا کدھر سے؟"

ٹھکرائن نے رو کر کہا: ''میں تو لٹ گئی بھیّا! بیاہ سر پر ہے۔ کیا ہو گا؟ بھگوان! تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں، نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔''

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا: ''مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

ٹھکرائن: ''نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو بھی مجھے یہی خیال رہے گا کہ کسی باہر کے آدمی کا کیا ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو، پر چور آیا باہر سے، تمھارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔''

ٹھاکر: ''ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ہو، کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟''

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا: ''میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں، کوئی پہلے ہی موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔''

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے، جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی: ''اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔''

ٹھاکر صاحب نے کہا: ''ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتا لگ جانے سے کیا! مال تو جانا تھا، وہ گیا، اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپے کی کوئی تجویز کرنی ہو گی۔''

پرکاش: ''میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔''

ٹھاکر: ''کیوں اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔''

پرکاش: ''آپ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانے میں بیٹھی ہے، ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا، کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا رستہ بند ہی ہو جانا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ہے۔''

ٹھکرائن ڈریں: ''تم جاؤ گے بھیّا! تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔''

پرکاش: ''کچھ بھی ہو ماتا جی! مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔''

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے سے خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا: ''ایک سیٹھ کے ہاں ۵۰ روپے ماہوار کا کام مل گیا ہے مگر وہ روپے میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہو گی۔ اس میں ایک پیسہ گھر کے خرچ نہ آنے دوں گا۔''

خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پا کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوتاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا، وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا۔ اس کی چابی کہاں ہے؟ اس کا چمپا کو پتا نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں ''کچھ پرانی کتابیں ماری ماری پھرتی تھیں، اٹھا کر صندوق میں بند کر دی ہیں۔'' چمپا کو شک کی گنجایش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی تو دیکھا، وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ شبہے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی، جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینا تھا، گرمی کے مارے دم گھٹتا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے؟

ایک دن چمپا نے کمرے میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا: ''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی: ''میں کیوں ہٹانے لگی۔''

''پھر کس نے ہٹایا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''گھر میں تم رہتی ہو، جانے کون؟ ''

''اچھا! اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں یوں ہی پوچھا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں نہ دیکھ لیں، پرکاش کو چین کہاں، چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی، وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر بہلانے کے لیے بولا:

''طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی، پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا! پکوڑیاں ہیں؟''

آج چمپا کے دل میں شبہے کا وہ اکھوا، جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے، یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خریدی اور صندوق کھول ڈالا۔ ''ارے، یہ تو زیور ہیں۔'' اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا: ''یہ کہاں سے آئے؟ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔'' معاً اس کے دل میں خیال گزرا، ''یہ زیور ٹھاکر صاحب کے تو نہیں؟'' چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا لیکن ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے یک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ''ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں، چوری زیوروں کے لیے؟ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟''

(۲)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ تب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے تھے، مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے، شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ مینیجر کی جگہ خالی ہوئی، پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملے پر بات چل پڑی، ٹھاکر صاحب نے کہا: ''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا لیا: ''دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟''

''اجی درخواست تو دو، اگر سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی، اس کی فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا: ''آپ نقد ضمانت داخل کر دیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے؟''

پرکاش گھر کی طرف چلا تو اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینے پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آ کر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر مونھ پھیر لیا، پھر ایک منٹ بعد بولی:

''ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی۔ جگہ نہ ملتی نہ سہی روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمھارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔''

''یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں۔''

چمپا نے کہا: ''آدمی کی نیّت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔''

پرکاش سنّاٹے میں آ گیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے مونھ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا۔ مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے؟ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی بند کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا: ''تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیّت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟'' جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا: ''کچھ نہیں، میں نے دنیا کی بات کی تھی۔''

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے، جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے! اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا، اکٹھا ہو کر نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحّش کر دیتا ہے۔ تب ہمارے مونھ سے نکل پڑتا ہے افسوس! چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطے پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(۷)

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویرا ندر اور اس کی نئی دلھن بھی آئے ہوئے ہیں۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا: ''آج آپ کو یہاں رہنا ہو گا دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔''

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے، اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تین عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرھانے چابیوں کا گچھّا پڑا تھا۔ پرکاش نے گچھّا اٹھالیا۔ پھر کمرا کھول کر صندوق میں سے زیورات کا ڈبّا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا ڈر تھا، آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا، حرارت، اضطراب اور خلش سے پُر، اب بخار کا اتار تھا، سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹا تھا۔ آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویر اندر کا کمرا کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبّا رکھ دیا۔ پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ آیا۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھّا اس کے سرھانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش رات کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا بیٹھا۔ دیکھنا چاہتا تھا، وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویر اندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا: ”بابو جی! کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی، جو زیور چوری ہو گئے تھے، سب مل گئے۔“

ٹھاکر صاحب بھی آگئے اور بولے: ”بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری، پورے کا پورا ڈبّا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔“

ٹھاکر: ”آج اسی خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔“

پرکاش: ”آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوالیا کسی سے۔“

ٹھاکر: ”کئی پنڈتوں سے۔“

پرکاش: ”تو بس اس کی برکت ہے۔“

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدّت کے بعد گھر آگیا ہو۔

پرکاش نے کہا: ”آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔“

”میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔“

”تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔“

”مجھے تو اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں خرچ کرنے سے بھی ارمان پورا نہ ہو گا۔“

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

(زادِ راہ)

پریم چند (۱۸۸۱ء۔۱۹۳۶ء)

پریم چند ضلع بنارس کے ایک گاؤں ملھی پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے اور والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ پریم چند کی زندگی کا آغاز بڑے حوصلہ شکن حالات میں ہوا۔ سوتیلی ماں کے ظلم وستم کے باعث ان کی ابتدائی تعلیم ٹھیک طرح سے نہ ہو سکی۔ تاہم انھوں نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے اور پھر جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۹۰۱ء سے باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوا جو آخر دم تک جاری رہا۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ **سوزِ وطن** کے نام سے شائع ہوا، جس پر حکومت نے پابندی لگا کر نذرِ آتش کر دیا۔ اُن کے افسانوں کے دیگر مجموعوں میں **زادِ راہ**، **پریم پچیسی**، **پریم بتیسی**، **پریم چالیسی** اور **واردات** وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے **میدانِ عمل**، **گئودان** وغیرہ ناول بھی لکھے۔

پریم چند کا اسلوبِ بیان سادہ اور دلکش ہے۔ وہ دیہات اور شہر دونوں طرح کے ماحول اور پس منظر کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ تاہم دیہاتی زندگی کو انھوں نے بڑے سلیقے سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

الف۔ پرکاش کی زندگی کے شیریں خواب مٹّی میں کیوں مل گئے؟

ب۔ اومادیوی نے پرکاش سے کس سلسلے میں مشورہ لیا؟

ج۔ پانچ ہزار کے زیور کی خریداری پر پرکاش کی کیا کیفیّت ہوئی؟

د۔ پرکاش نے چمپا کو کن الفاظ میں تسلی دی؟

ہ۔ پرکاش نے زیورات کا ڈبّا کیوں چوری کیا؟

و۔ چمپا نے یہ کیوں کہا کہ آدمی کی نیّت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟

ز۔ زیور کا ڈبّا واپس رکھنے کے بعد پرکاش نے کیا محسوس کیا؟

ح۔ آپ اس افسانے کو پڑھ کر کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

۲۔ سبق کا متن مدِّ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں۔

ا۔ چمپا کی بات سُن کر پرکاش کا ردِّ عمل کیا تھا؟

الف۔ اس نے شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ ب۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

ج۔ اس نے پیسہ کمانے کا منصوبہ بنایا۔ د۔ وہ اپنی قسمت کو کوس کر رہ گیا۔

۲۔ چور کے پاؤں کا نشان دیکھنے کے لیے چھت پر کون گیا؟

الف۔ اکیلا پرکاش ب۔ ٹھاکر اور پرکاش ج۔ ٹھاکر، ٹھکرائن اور پرکاش د۔ ٹھکرائن اور پرکاش

۳۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے پرکاش نے کیا کیا؟

الف۔ پولیس کو اطلاع دی ب۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کی

ج۔ چور کی تلاش میں مدد دی۔ د۔ اس نے وہ گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

۴۔ پرکاش نے زیور کا ڈبّا کیوں واپس رکھ دیا؟

الف۔ پکڑے جانے کے خوف سے
ب۔ ٹھاکر سے تعلق کی وجہ سے
ج۔ بیوی کی ناراضی کے باعث
د۔ اپنے ضمیر کی آواز پر

۳۔ درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

تذبذب ڈھنگ پوبارہ سیندھ منڈیر خمیازہ پونجی طشتری بساطی متوحّش

۴۔ جملہ خبریہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ جملہ فعلیہ ۲۔ جملہ اسمیہ

جملہ فعلیہ وہ جملہ ہے جو کم از کم فعل اور فاعل سے مل کر بنا ہو۔ فعل ایک ایسا کلمہ ہے جو اکیلا اپنے معنی دیتا ہے اور اس میں تین زمانوں ماضی، حال اور مستقبل میں سے کوئی ایک زمانہ پایا جاتا ہے جب کہ فاعل وہ اسم ہے جس سے کوئی کام سرانجام پاتا ہے۔ مثلاً زید بیٹھا۔ عمر سویا وغیرہ۔

ان جملوں میں زید اور عمر فاعل ہیں اور بیٹھا، سویا فعل ہیں۔

اگر فعل لازم ہو تو اس کے لیے جملے میں مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ اوپر دیے گئے جملوں سے ظاہر ہے۔ ان میں فاعل اور فعل مل کر جملہ فعلیہ بناتے ہیں۔ لیکن اگر فعل متعدی ہو تو اس کے لیے مفعول کی بھی ضرورت ہوتی ہے جیسے:

احمد نے سبق پڑھا۔ حماد نے کھانا کھایا۔

ان جملوں میں 'پڑھا' اور 'کھایا' فعل متعدی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پڑھا اور کیا کھایا۔ چنانچہ یہ بتانا ضروری ہے کہ سبق پڑھا اور کھانا کھایا۔ یہاں 'سبق' اور 'کھانا' مفعول کے طور پر جملے میں آئے ہیں۔ احمد اور حماد فاعل ہیں۔ اس طرح فاعل، فعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے قبل افسانے کا تعارف کرایا جائے۔
- پریم چند کے افسانوں کے موضوعات اور ان کی حقیقت نگاری پر روشنی ڈالی جائے۔
- مصنّف کے اُسلوب اور زبان پر آسان پیرائے میں روشنی ڈالیں۔
- قواعدی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ مثالوں کے ساتھ واضح کریں۔

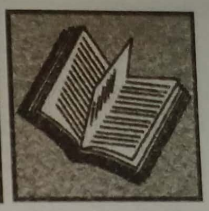

7 آرام و سکون

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ڈرامے کو پڑھ کر اس کے لوازمات سے آگاہ ہو سکیں۔
- مکالمے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے احساس کی شدت، فقرے کے زیر و بم، الفاظ کے تلفظ، رموزِ اوقاف کے ادراک اور ادائیگی کی دیگر خصوصیات کا لحاظ رکھ سکیں۔
- جملہ اسمیہ کے اجزاء کی نشاندہی کر سکیں نیز مبتدا اور خبر سے آگاہ ہو سکیں۔
- روزمرہ اور محاورہ کی خصوصیات پیشِ نظر رکھتے ہوئے فقروں کی تصحیح کر سکیں۔

پڑھیں

کردار: ڈاکٹر۔ میاں۔ بیوی۔ للّو (ملازم)۔ فقیر۔ بچہ

منظر: گھر کا ایک کمرا، جس میں دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی ہے۔ ایک طرف دو کرسیاں دھری ہیں اور میز پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر میاں کا معائنہ کر رہا ہے۔

ڈاکٹر: جی نہیں بیگم صاحبہ! تردّد کی کوئی بات نہیں، میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے۔ صرف تھکان کی وجہ سے حرارت ہو گئی ہے۔ ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں۔

بیوی: ڈاکٹر صاحب! ان دنوں کیا، ان کا ہمیشہ سے یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام سات بجے سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے۔

ڈاکٹر: جبھی تو! میرے خیال میں انھیں دوا سے زیادہ آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ کاروبار کی پریشانیاں اور الجھنیں بھُلا کر ایک بھی روز آرام و سکون سے گزرا تو طبیعت ان شاءاللہ بحال ہو جائے گی۔

بیوی: بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں۔ اتنا کام نہ کیا کرو، نہ کیا کرو۔ نصیبِ دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مگر خاک اثر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں، کیا کیا جائے۔ ان دنوں کام بے طرح زوروں پر ہے۔

ڈاکٹر: ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام و سکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

بیوی: یہ بات آپ نے انھیں بھی سمجھائی! میں نے کہا سُن رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

میاں: ہوں!

ڈاکٹر: جی ہاں! میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کر دی ہے کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں۔

بیوی: تو تاکید کیا میں نہیں کرتی! مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو!

ڈاکٹر: جی نہیں! ابھی انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ پورے طور سے میری ہدایات پر عمل کریں گے۔

بیوی: اور دوا کس کس وقت دینی ہے؟

ڈاکٹر: جی نہیں! دوا کی مطلق ضرورت نہیں۔ بس آپ صرف ان کے آرام وسکون کا خیال رکھیے۔ غذا جو کچھ دینی ہے، میں لکھ چکا ہوں۔

بیوی: بڑی مہربانی آپ کی۔

ڈاکٹر: تو پھر اجازت۔

بیوی: فیس میں آپ کو بھجوادوں گی۔

ڈاکٹر: اس کی کوئی بات نہیں۔ آجائے گی۔

بیوی: (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للّو! میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو۔

ڈاکٹر: ایک بات عرض کردوں بیگم صاحبہ! مریض کے کمرے میں شور غُل نہیں ہونا چاہیے۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویت بخشتی ہے۔

بیوی: مجھے کیا معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ ان کے کمرے میں پرندہ پَر نہ مارے گا۔

(ملازم آتا ہے)

للّو: حضور!

ڈاکٹر: اٹھالو یہ بیگ۔ تو آداب!

بیوی: آداب! (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں۔ قریب آکر) میں نے کہا سو گئے کیا؟

میاں: ہوں! یونہی چپکا پڑا ہوا تھا۔

بیوی: بس بس۔ بس بس۔ چپکے ہی پڑے رہیے۔ ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ نہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے۔ اس سے بھی تھکان ہوتی ہے۔ تمام دن پورے آرام وسکون میں گزاریں۔ سمجھ گئے نا؟

میاں: ہوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا؟

میاں: ہُوں۔

بیوی: کہو تو دبادوں؟

میاں: ہُوں۔

بیوی: سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں؟

میاں: اچھی بات۔ (کراہتا ہے)

بیوی: اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو! اچھا بلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں۔ گھنٹی کہاں گئی؟ رات میں نے آپ یہاں میز پر رکھی تھی۔ اللہ جانے یہ کون اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے؟

(کنڈی کی آواز) کون ہے یہ نامراد؟ ارے للّو! دیکھو، یہ کون کواڑ توڑے ڈال رہا ہے؟

للّو: (دور سے) سقّا ہے بیوی جی!

بیوی: سقّا؟ گھر میں بہرے بستے ہیں جو کم بخت اس زور سے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو یہ کیا وقت ہے، پانی لانے کا۔ اچھی خاصی دوپہر ہونے آگئی ہے۔ کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی۔ میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے۔ کان پر جوں نہیں رینگتی۔

میاں: ارے بھئی اب بخشو اسے۔

بیوی: بخشوں کیسے؟ ذرا طرح دو، یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

میاں: ہُوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کیوں۔ زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے؟

میاں: ہُوں۔

بیوی: للّو سے کہوں آکر دبا دے؟

میاں: اُوں ہُوں!

بیوی: یہ دیکھو۔ یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے۔ آپ بتایئے آپ سے آپ آگئی یہاں؟ پاؤں تھے اس کے؟ یہ سب حرکتیں اس للّو کی ہیں۔ کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہنے دے گا۔ اللہ جانے یہ نامراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے؟ للّو! ارے للّو!

میاں: ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو۔ گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھی تھی۔ ہوں! (کراہتا ہے)

بیوی: تم نے؟ اے ہے وہ کیوں؟

میاں: ننّھا بار بار بجائے جا رہا تھا۔ میرا دم الجھنے لگا تھا۔ ہوں (کراہتا ہے)

للّو: (آکر) مجھے بلایا ہے بیوی جی؟

بیوی: کم بخت اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں، کہاں مر گیا تھا؟

للّو: آپ نے ریٹھے کوٹنے کو کہا۔ وہ گودام میں ڈھونڈ رہا تھا۔

میاں: ہُوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: صبح سویرے کہا تھا، کم بخت تجھے اب تک ریٹھے مل نہیں چکے؟

للّو: جی مہلت بھی ملے۔ ادھر گودام میں جاتا ہوں، ادھر کوئی بلا لیتا ہے۔

بیوی: ہاں بڑا کام رہتا ہے نا! بیچارے کو سر کھجانے کو فرصت نہیں ملتی۔ بھاگ یہاں سے...، نکل، جا کر ریٹھے ڈھونڈ (للّو جاتا ہے) تو یہ گھنٹی یہاں تمھارے سرہانے رکھ جاتی ہوں۔

میاں: (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا۔

بیوی: پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا؟

میاں: (تنگ آکر) نہیں بابا نہیں۔

بیوی: ارے ہاں۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں۔ کہاں گیا ان کا لکھا ہوا کاغذ؟ اے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے۔ ابھی کہیں کوڑے میں چلا جاتا تو۔ مالٹڈ ملک (MALTED MILK) نارنگی کا رس، ساگو دانے کی کھیر، یخنی کیا تیار کروا دوں اس وقت کے لیے؟

میاں: جو جی چاہے۔

بیوی: اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھے؟

میاں: ساگو دانہ بنا دینا تھوڑا سا۔

بیوی: بس! اس سے کیا بنے گا؟ یخنی پی لیتے تھوڑی سی۔ چوزے کی یخنی بنوائے دیتی ہوں۔ مقوّی چیز ہے۔

میاں: بنوا دو۔

بیوی: (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا۔ دیر لگ جائے گی یخنی کی تیاری میں، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا۔ اس للّو کو تو جانتے ہو۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے۔

میاں: اُوں ہُوں۔

بیوی: تو پھر یوں کرتی ہوں۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے)

میاں: ارے بھئی، اب یہ کیا کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔

بیوی: ننّھا ہے آپ کا۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا۔ نہ اس کم بخت کا دل اس سے بھرتا ہے، نہ وہ کم بخت ٹوٹتی ہے۔ ارے میں نے کہا ننّھے نہیں مانے گا نامراد! چھوڑ اس اپنی پِٹ پِٹ کو۔ جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پُر ہونے ہی میں نہیں آتا۔ چولھے میں جھونک دوں گی اس کم بخت کو، اتنا خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں۔ شور غُل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے۔

میاں: ہُوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کم نہیں ہوا درد؟

میاں: اُوں ہُوں۔

بیوی: دبوا لیتے تو گھٹ جاتا۔

میاں: اُوں ہُوں۔

بیوی: تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی۔

(پھر ننّھے کی پَٹ پَٹ کی آواز) پھر وہی۔ نہیں مانے گا نامراد! ٹھہر تو جا (غصّے میں جاتی ہے۔ میاں کراہتا ہے۔ دور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے) چھوڑ اپنی یہ پَٹ پَٹ۔ (بچہ رونے لگتا ہے) چپ نامراد! اتنا خیال نہیں ابّا بیمار پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے شور غُل نہ ہو، انھیں تکلیف ہو گی۔ چپ! خبردار جو آواز نکالی۔ گلا گھونٹ ڈالوں گی۔ (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کم بخت کا جو کھیل ہے، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے۔ چل ادھر۔ نہیں چپ ہو گا تو؟ (کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔ میاں اس ہنگامے سے زِچ ہو کر کراہے جا رہا ہے۔ بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی کمرے میں جھاڑ و پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے)۔

میاں: (چونک کر) ہُوں؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی؟ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ۔ ارے کیا ہو رہا ہے؟

ملازم: جھاڑو دے رہا ہوں میاں۔

میاں: کم بخت دفع ہو یہاں سے۔

ملازم: جھاڑو نہ دی تو خفا ہوں گی بی بی جی۔

میاں: بی بی جی کا بچہ! نکل یہاں سے۔ کہ دے ان سے (ملازم جاتا ہے) کواڑ بند کر کے جا۔ (میاں کراہ کر چپ ہو جاتا ہے، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہتی ہے) ارے بھئی کہاں گئیں؟ ارے کوئی ٹیلی فون سننے تو آؤ۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ (خود اٹھتا ہے) ہیلو، میں اشفاق بول رہا ہوں۔ بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں۔ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں جی۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جو انھیں بلا لائے۔ میں علیل ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں کہ گلا بھی خراب ہو۔ آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا۔ میں نے عرض کیا نا، چوں کہ میں بیمار ہوں، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ (زور سے فون بند کرتا ہے) بد تہذیب۔ گستاخ کہیں کی۔ ہُوں۔

بیوی: مجھے بلایا تھا؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں۔

میاں: اتنی آوازیں دیں۔ کوئی سنے بھی۔

بیوی: توبہ توبہ، لیٹو لیٹو، میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی۔ لکّو کو ریٹھے نکال کر دے رہی تھی۔ بلایا کیوں تھا؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے)۔

میاں: فون تھا تمھارا۔

بیوی: کس نے کیا تھا؟

میاں: ہو گا کوئی۔ اب مجھے کیا پتا۔

بیوی: جب اٹھ ہی کھڑے ہوئے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا؟

میاں: میں نے کہ دیا تھا پھر کر لیں فون۔

بیوی: مفت کی الجھن میں ڈال دیا۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی؟

میاں: ارے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحب زادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

بیوی: اب اسے کیوں کر روک دوں میں؟

میاں: بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو۔ میں بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا، میرے لیے آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ ایک روز ان صاحب زادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی!

بیوی: کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں۔

میاں: مناسب الفاظ میں لکھو نا۔ ہُوں (کراہتا ہے)

(بے سُرے گانے کا شور جاری ہے۔ میاں کراہ رہا ہے۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز)

بیوی: ارے کیا ہو گیا ننھے؟

بچہ: (زور سے) گر پڑا خون نکل آیا۔

بیوی: (زور سے) خط لکھ رہی ہوں۔ ابھی آئی، چپ ہو جا۔

میاں: (کراہتے ہوئے) یک نہ شُد دو شُد۔

بیوی: توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں، خط لکھ رہی ہوں۔ بچے کو چپ کیوں کر کرا سکتی ہوں؟ نامراد! چپ ہو جا۔ خون نکل آیا تو قیامت آ گئی۔ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں۔

(میاں کراہتا ہے۔ بے سرے گانے اور بچے کے رونے کی آواز جاری ہے)۔

میاں: ختم نہیں ہوا خط؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو۔

بیوی: ابھی ہوا جاتا ہے ختم۔

(اس غُل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے)

فقیر: بال بچے کی خیر۔ راہِ مولا کچھ مل جائے فقیر کو۔

میاں: (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی، ہُوں۔

بیوی: تو اب میں تو اسے بلا کر لے نہیں آئی۔

میاں: ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ۔

بیوی: اولّو! ارے اولّو!

(لکّو ہاون دستے میں ریٹھے کوٹنے شروع کر دیتا ہے۔ بے سرے گانے میں بچے کے رونے اور فقیر کی صدا اور ہاون دستے کی دھمک اور شامل ہو جاتی ہے)۔

میاں: ہائے توبہ، توبہ، ہائے!

بیوی: ارے نامراد! ریٹھے پھر کوٹ لینا۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر دے (لکّو ریٹھے کوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سنتا)

میاں: (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) میری ٹوپی اور شیروانی دینا۔

بیوی: ٹوپی اور شیروانی!!

میاں: ہاں! میں دفتر جا رہا ہوں، ابھی دفتر جا رہا ہوں۔

بیوی: ہے ہے! وہ کیوں؟

میاں: آرام و سکون کے لیے۔

(امتیاز علی تاج کے یک بابی ڈرامے)

امتیاز علی تاجؔ (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۷۰ء)

امتیاز علی تاجؔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شمس العلما مولوی ممتاز علی تھا۔ جو دیوبند سے نقل مکانی کر کے لاہور میں آباد ہوئے تھے۔ امتیاز علی تاجؔ نے سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کے بعد صحافت کے پیشے کو اپنا لیا۔ وہ بہت سے رسالوں کے مدیر تھے، جن میں **پھول**، **تہذیبِ نسواں** اور **کہکشاں** قابلِ ذکر ہیں۔ وہ مجلس ترقیِ ادب کے ناظم بھی رہے۔ صحافت کے ساتھ ساتھ انھیں ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے فنِ ڈراما نگاری کی طرف توجہ دی اور آخر دم تک اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے بے شمار ڈرامے لکھے۔

امتیاز علی تاجؔ کے ڈراموں میں برجستگی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ انھوں نے مکالمہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی۔ **انارکلی** ان کا شاہکار ڈراما ہے۔

ان کی تحریر سادہ اور بے تکلّف ہے، الفاظ کے استعمال میں سلیقہ اور خوبصورتی ہے۔ وہ معمولی الفاظ کو بھی اتنی خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ قاری کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔

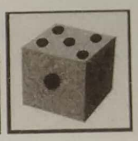

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

الف۔ میاں کو کون سی بیماری تھی؟

ب۔ بیوی کے اونچی آواز سے پکارنے پر ڈاکٹر نے کیا کہا؟

ج۔ بیوی نے گھنٹی کہاں رکھی تھی اور اُسے کہاں سے ملی؟

د۔ بیوی نے یخنی کی تیاری میں کیا عذر پیش کیا؟

ز۔ کھلونا گاڑی کی پٹ پٹ کی آواز پر بیوی نے کیا کہا؟

س۔ میاں نے فون کرنے والے کو کیا جواب دیا؟

ص۔ ہمسائے کے گھر سے ہارمونیم کی آواز پر میاں کا ردِّ عمل کیا تھا؟

و۔ میاں نے بیوی سے ٹوپی اور شیروانی کیوں مانگی؟

ہ۔ آوازوں کے شور میں سب سے نمایاں آواز کس کی تھی؟

ی۔ اس ڈرامے کو پڑھ کر آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟

۲۔ سبق کا متن مدِّ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i) سبق آرام و سکون کس نے لکھا ہے؟

الف۔ سید امتیاز علی تاج نے ب۔ میرزا ادیب نے ج۔ پریم چند نے

ii) سبق آرام و سکون کا تعلق کس صنفِ ادب سے ہے؟

الف۔ افسانہ ب۔ ڈراما ج۔ ناول

iii) میاں کو کس کی وجہ سے حرارت ہو گئی تھی؟

الف۔ گرمی کی وجہ سے ب۔ تکان کی وجہ سے ج۔ سردی کی وجہ سے

iv) میاں صبح کتنے بجے دفتر جاتے تھے؟

الف۔ آٹھ بجے ب۔ نو بجے ج۔ دس بجے

v) میاں نے کھانے کے لیے کیا بنانے کو کہا؟

الف۔ ساگودانہ ب۔ چکن کڑاھی ج۔ کھیر

vi) ڈراما آرام و سکون میں میاں کا نام کیا تھا؟

الف۔ اشفاق ب۔ اشتیاق ج۔ رزاق

vii) ہمسائے کا صاحبزادہ کیا بجا رہا تھا؟

الف۔ طبلہ ب۔ ڈھول ج۔ ہارمونیم

viii) ملازم للوہاون دستے میں کیا کُوٹ رہا تھا؟

الف۔ چٹنی ب۔ پتھر ج۔ ریٹھے

۳۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں:

ضرورت وقت ہدایات غذا طبیعت

۴۔ مذکّر کے مونّث اور مونّث کے مذکّر لکھیں۔

ملازم فقیر سقّا بیوی مریضہ

۵۔ آپ مُسند اور مسند الیہ کے بارے میں جان چکے ہیں۔ جو مرکب تام کے دو حصے ہیں۔ اگر مُسند اور مُسند الیہ دونوں اسم ہوں تو یہ مل کر جملہ اسمیہ بنائیں گے۔ مثلاً احمد نیک ہے، میں "احمد" اسم مُسند الیہ اور "نیک" اسم صفت ہے۔ چنانچہ یہ جملہ اسمیہ ہوا۔

جملہ اسمیہ کے درج ذیل اجزا ہیں:

۱۔ اسم یا مبتدا ۲۔ متعلق خبر ۳۔ خبر ۴۔ فعل ناقص

مثال: احمد گھر میں موجود ہے۔

اس جملے میں "احمد" اسم یا مبتدا ہے۔ "گھر میں" متعلق خبر ہے۔ "موجود" خبر ہے اور "ہے" فعل ناقص ہے۔

آپ اس سبق میں سے پانچ اسمیہ جملوں کی نشاندہی کر کے ان میں درج بالا اجزا الگ الگ کریں۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

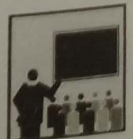

- سبق خوانی سے قبل بچوں کو ڈرامے کے فنی عناصر سے آگاہ کیا جائے۔ کردار، منظر، لہجے کے اتار چڑھاؤ، ادائیگی وغیرہ
- مصنّف کے دیگر ڈراموں خاص طور پر انار کلی کے بارے میں بتایا جائے۔
- سبق کے مرکزی نکتے کی وضاحت کی جائے۔
- مصنّف کے اندازِ بیاں اور زباں کے بارے میں سادہ اور آسان لفظوں میں وضاحت کی جائے۔

8

نئ ہمسائی

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ڈراما پڑھ اور سُن کر بات کے مرکزی خیال، مقصود تک رسائی حاصل کر سکیں۔
- مختلف اصنافِ نثر میں امتیاز کر سکیں۔
- غلط فقرات کی روزمرے اور محاورے کے لحاظ سے درستی کر سکیں۔
- خود کوئی مکالمہ یا ڈائری لکھ سکیں۔

پڑھیں

کردار:

زینت، رشیدہ، جمیلہ، نگہت، رُقیہ اور ایک لڑکی

منظر:

رشیدہ کے مکان کا صحن

(صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ دس گیارہ کا عالم ہوگا۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہے، جس کی پائنتی کی طرف رشیدہ بیٹھی سلائیوں سے سوئٹر بن رہی ہے، عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے پاس زینت بیٹھی ہے، زینت کی عمر پچیس برس کے قریب ہوگی۔ اس وقت وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف نظر آتی ہے۔

چند لمحے دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں۔ زینت کتاب سے نظریں ہٹا کر رشیدہ کو ایک خاص انداز میں دیکھنے لگتی ہے۔)

زینت: تو آپا!

رشیدہ: ہُوں!

زینت: میں کہتی ہوں یہ بھید کیا ہے آخر؟ رشیدہ آپا! کچھ معلوم بھی تو ہو، تم سب کچھ جانتی ہو مگر بتاتی نہیں۔

رشیدہ: (مسکراتی ہے) جانتی تو ہوں۔

زینت: تو (رازدارانہ انداز میں) بتاؤ نا!

رشیدہ: ذرا یہ تو معلوم ہو، آخر تمھیں اس سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟

زینت: دلچسپی! کیسی دلچسپی؟

رشیدہ: عام عورتوں کی طرح وہ بھی ایک عورت ہے، ہماری طرح رہتی ہے، ہماری طرح کھاتی ہے، بس!

زینت: مجھے بنا رہی ہو آپا!

رشیدہ: اونہوں!

زینت: کیا بات ہوئی یہ؟ عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے، اگر وہ ایسی ہی ہوتی تو میں پوچھتی کیوں بھلا، معاملہ تو یہ ہے کہ وہ بڑی عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ چھے ماہ ہوئے، اس مکان میں آئے ہوئے مگر کیا مجال، جو کسی سے ایک لفظ بھی کہا ہو اس نے۔

رشیدہ: پھر کیا ہوا؟

زینت: گویا کچھ ہوا ہی نہیں؟ ہُونہُہ!

رشیدہ: بات صرف اتنی ہے کہ وہ کچھ ڈرتی ہے میل ملاپ سے۔

زینت: کیوں؟

رشیدہ: کیوں؟ (مُسکراتی ہے) یہی تو اصل قصّہ ہے۔ ڈرتی ہے اس طرح شاید بھید کھُل جائے۔

زینت: (اور قریب آکر) یہی تو میں بھی پوچھتی ہوں۔ یہ بھید کیا ہے؟ جانتی ہو آپا سب کچھ، پر بتاتی نہیں ہو۔

رشیدہ: میں نے کب کہا یہ بھید مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہے اور خوب معلوم ہے، پر سُن کر کرو گی کیا؟ یہی سمجھ لو بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمسایوں سے کم بولتی ہیں اور بعض تو بولتی ہی نہیں۔ یہ تمھاری ہمسائی ان ہی عورتوں میں سے ایک ہے۔

زینت: (روٹھ جانے کی کیفیّت کا اظہار کرتے ہوئے) نہ بتاؤ آپا!

رشیدہ: اچھا بابا سن لو (سرگوشی کے انداز میں) یہ محبّت کا کرشمہ ہے۔

زینت: محبت کا کرشمہ!!

رشیدہ: بچپن میں اسے کسی سے محبت تھی، بڑی گہری محبّت۔ دونوں ایک ہی جگہ کھیلتے تھے، ایک ہی جگہ پڑھتے تھے۔ رشتے دار تھے نا! خیال تھا ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور دنیا کو اپنے لیے جنّت بنالیں گے (آہ بھر کر) محبت کے خواب دیکھنے والے یہی بات سوچا کرتے ہیں مگر دنیا والے سخت سنگ دل ہیں، کسی کی محبت کو پروان چڑھتے دیکھ نہیں سکتے۔

زینت: آپا تم نے تو افسانہ سنانا شروع کر دیا۔ سمجھ لیا ان میں محبّت تھی، آگے کہو کچھ۔

رشیدہ: (آہ بھر کر) محبّت تھی ان بے چاروں میں!

زینت: مانتی ہوں، ہو گی اور ضرور ہو گی۔

رشیدہ: یہ بے صبری مجھے پسند نہیں۔

زینت: ہائے اللہ! تم تو ناراض ہی ہو گئیں۔ (منانے کے انداز میں) میری اچھی آپا!

رشیدہ: تمھیں کیا خبر محبت کیا ہوتی ہے؟ وہی جانتا ہے جس کے دل میں یہ آگ بھڑک چکی ہو۔ خیر ان دونوں کو آپس میں بڑی گہری محبّت تھی مگر اس عورت کی شادی کہیں اور ہو گئی۔

زینت: اس ہمسائی کی شادی؟

رشیدہ: اور کس کی بات کر رہی ہوں؟ (آہ بھر کر) محبّت کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ بے چاری اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک دن ایک خط آیا۔ یہ اس کے محبوب کا خط تھا۔ بد قسمتی سے یہ خط اس کے شوہر نے دیکھ لیا۔ تعلّقات میں تلخی پیدا ہو گئی۔ شوہر سے الگ ہو گئی... بس الگ ہو گئی اور...

زینت: اور اب یہاں رہتی ہے۔

رشیدہ: اور کیا؟ یہ راز اپنے تک ہی رکھنا، سُن لیا! کسی کا بھید دوسروں کو کیوں بتایا جائے، بے چاری دُکھی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے۔

زینت: اچھّا آپا!

(جمیلہ آتی ہے زینت کی ہم عمر ہو گی۔ ہاتھ میں اون اور سلائیاں ہیں۔ زینت کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے)

آؤ جمیلہ! اتنی جلدی آ گئی ہو۔ بھائی جان آ گئے کیا؟

جمیلہ: صبح ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔ عموماً ایک بجے کھانا کھانے آتے ہیں مگر آج نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا چلو رشیدہ آپا کے پاس جائیں، دھوپ میں بیٹھیں۔

رشیدہ: میں ذرا نیچے دیکھ آؤں۔ شاید وہ آ گئے ہیں۔

(رشیدہ اٹھ کر چلی جاتی ہے)

زینت: (رازدارانہ لہجے میں) آج بھید معلوم ہوا نئی ہمسائی کا۔

جمیلہ: اچھا۔ بتاؤ تو۔

زینت: بتاؤ گی تو نہیں کسی کو؟ آپا رشیدہ سے پکا وعدہ کیا ہے کہ میں کسی کو بتاؤں گی نہیں۔

جمیلہ: میں کیوں بتانے لگی کسی کو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟ میری عادت جانتی ہو۔ سینہ سمندر ہے میرا۔ جو کچھ ڈالوں غرق۔

زینت: جو کچھ ڈالوں غرق (مسکرا کر جمیلہ کی طرف دیکھتی ہے) خوب!

جمیلہ: مذاق نہ سمجھو زینت! سچ کہتی ہوں۔ مجھے تو لگائی بجھائی کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ اپنا تو کام یہ ہے کہ سب کی سنو اور بھول جاؤ۔

زینت: بات یہ ہے کہ ہماری یہ نئی ہمسائی جو ایک معمّا بنی ہوئی ہے، محبّت کی زخم رسیدہ ہے۔ بچپن میں کسی سے محبّت ہو گئی تھی مگر وہاں شادی نہ ہو سکی۔

جمیلہ: (مسکرا کر) پھر؟

زینت: مسکرا کیوں رہی ہو؟

جمیلہ: تم بتاتی جاؤ... واقعہ شاید یہ ہو گا کہ ایک دن اس کے محبوب کا خط آیا ہو گا اور اس کے شوہر نے...

زینت: رشیدہ آپا تو کہتی تھیں کہ یہ بھید کسی کو معلوم ہی نہیں!

جمیلہ: دیکھ لو... ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے سب کچھ۔

زینت: تم نے کسی سے یہ حادثہ سن لیا ہو گا۔

جمیلہ: اگر یہ حادثہ نئی ہمسائی کے متعلق ہے تو غلط ہے۔

زینت: نئی ہمسائی کے متعلق نہیں تو اور کس کے متعلّق ہو گا؟

جمیلہ: کسی سے کہو گی تو نہیں؟

زینت: واہ میں کیوں کہوں گی!

جمیلہ: (بڑی رازداری سے) یہ اس کا اپنا قصّہ ہے۔

زینت: رشیدہ آپا کا اپنا؟

جمیلہ: ہاں۔

زینت: ہائے... میں خود حیران تھی کہ یہ محترمہ بار بار آہیں کیوں بھر رہی ہیں؟

جمیلہ: اب سُنو!

زینت: کیا؟

جمیلہ: مجھے بھید معلوم ہے... نئی ہمسائی کا۔

زینت: کیا؟

جمیلہ: معمولی سی بات ہے۔

زینت: ہوں (بڑے اشتیاق سے) بتاؤ نا جمیلہ!

جمیلہ: اسے بچپن سے ایکٹرس بننے کا شوق تھا۔ بڑی ہوئی تو یہی شوق لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ دن بھر فلم کمپنیوں میں ماری ماری پھرتی ہے اور رات کو آ کر سو جاتی ہے۔ کسی کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ایکٹرس ہے۔ کسی کو بھید معلوم نہ ہو جائے، اس لیے سب سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

زینت: تمھیں یہ کیوں کر معلوم ہوا؟

جمیلہ: ایسی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

زینت: عجیب معاملہ ہے۔ ایکٹرس بننے کا شوق مجھے بھی کسی زمانے میں تھا۔ یہ بچپن کا قصّہ ہے۔

جمیلہ: شوق تو مجھے بھی بڑا تھا اور جوانی تک رہا۔ گھر والوں سے چھپ چھپ کر فلمی رسالے پڑھا کرتی تھی۔ کیا کہوں تم سے تنہائی میں کیا کچھ سوچا کرتی تھی... (آہ بھر کر) سوچا کرتی تھی کہ اگر مجھے سکرین پر آنے کا موقع مل جائے تو کمال کر دکھاؤں گی۔

زینت: (مسکرا کر) "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"!

(نگہت آتی ہے۔ نگہت بائیس تئیس برس کی خوش وضع عورت ہے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

نگہت: ارے میں نے کہا زینت!

زینت: کیا ہے؟

نگہت: کیا باتیں ہو رہی ہیں جمیلہ سے۔ آپا کہاں ہیں؟

زینت: آپا ذرا نیچے گئی ہیں اور جمیلہ سے اس وقت بڑی خاص باتیں ہو رہی تھیں۔

نگہت: ہو رہی تھیں۔ ہو نہیں رہیں؟

زینت: جمیلہ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی ہے۔

نگہت: نئی ہمسائی والا قصہ تو نہیں چل رہا تھا۔ سچ کہو!

جمیلہ: اس میں کیا شک ہے؟

نگہت: پتا نہیں تُو نے کیا بتایا ہے زینت کو۔ مگر جو بات میں نے معلوم کی ہے وہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتی اور غلط ہو بھی کیوں؟

زینت: کیا ہے؟

نگہت: گویا بتا ہی دوں؟

زینت: بتاؤ گی کیوں نہیں؟

نگہت: اصل بھید معلوم ہو گیا ہے۔

جمیلہ: واقعی بتاؤ نا!

نگہت: روز سوچتی تھی کسی طرح یہ بھید معلوم کر لوں۔ کوئی بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔ کل اس کی ماما بازار سے مچھلی خرید کر لا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر بلا لیا۔ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر بھید معلوم کرنے کی کوشش کی... اس نے صاف صاف تو نہیں بتایا... پر... میں نے جو نتیجہ نکالا۔ وہ غلط نہیں ہے۔

زینت: کیا ہے نتیجہ؟

نگہت: سچی بات یہ ہے کہ بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کسی کی عزّت کا سوال ہے۔

(رشیدہ واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

جمیلہ: رشیدہ آپا! سنو نگہت نئی ہمسائی کا بھید معلوم کر کے آئی ہے۔

رشیدہ: ابھی تو بھئی عزّت کا سوال درپیش ہے۔

(سب ہنستی ہیں)

زینت: بتاؤ نا؟

نگہت: یہاں غیر کون ہے۔

رشیدہ: ہاں کوئی حرج نہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کا معاملہ ہے...

(ایک لڑکی آتی ہے)

لڑکی: (نگہت سے) باجی، آ گئے ہیں بھائی جان۔ کہتے ہیں جلدی آؤ۔

نگہت: آتی ہوں۔ تم جاؤ!

لڑکی: جلدی آجایئے باجی! کہتے ہیں میرا نیا سوٹ نکالو آکر۔

نگہت: سُن لیا ہے۔ ایک منٹ میں آتی ہوں۔ چلو تم۔

(لڑکی چلی جاتی ہے)

زینت: لو نگہت! اب تو تمھاری بہن چلی گئی ہے۔

نگہت: (سرگوشی کے انداز میں) کسی کے ساتھ چلی گئی تھی مگر وہ جانے اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے۔ اب بے چاری تنہا زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

زینت: گزارہ کیوں کر ہوتا ہے۔

نگہت: زیور بیچ بیچ کر گزارہ کر رہی ہے اور کیا کر سکتی ہے؟ جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو ایکٹرس بن جائے گی یا شاید واپس چلی جائے۔ ہمیں کیا پتا کیا کرے گی۔ لو بھئی (اٹھ بیٹھتی ہے) میں تو چلی۔ شاید آؤں ان کے چلے جانے کے بعد۔

(نگہت چلی جاتی ہے)

رشیدہ: (مسکرا کر) توبہ۔

زینت: توبہ کیسی آپا!

رشیدہ: سمجھتی ہے، جیسے کسی کو معلوم ہی نہیں، لیکن ایسی باتیں کبھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ کسی کو پتا ہو نہ ہو، ہمیں تو خبر ہے۔

جمیلہ: الٰہی خیر! کس بات کا پتا آپا!

رشیدہ: بیچاری نئی ہمسائی پہ الزام لگا رہی ہے۔ سچ ہے آئینے میں اپنی شکل ہی دکھائی دیتی ہے۔

جمیلہ: ذرا کھل کر کہو آپا! بھلا ہم جاہل کیا جانیں۔

رشیدہ: ہم کیوں دوسروں کا بھید کھولیں۔ چپ رہنا ہی بہتر ہے مگر چالاکی کی داد دیتی ہوں۔ کس صفائی سے اپنا الزام نئی ہمسائی پر لگا دیا ہے۔

زینت: یہ پہیلی نہیں بوجھی جاتی ہم سے آپا۔

رشیدہ: اسے اپنے تک رکھنا۔ کہیں سر پھٹوّل نہ ہو جائے۔ مجھے اس کی ایک پرانی سہیلی نے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں گھر سے چلی گئی تھیں محترمہ۔

زینت اور جمیلہ: (ایک ساتھ) اچھا!

رشیدہ: لیکن حالات بگڑے نہیں۔ باپ نے جلدی شادی کر دی۔ دیکھو تو بظاہر کتنی مسکین نظر آتی ہے۔ ہے نا!

زینت: (مایوسی سے) وہ معمّا تو حل نہیں ہوا۔

جمیلہ: (زینت کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) حل ہو چکا ہے اور چاہتی کیا ہو؟

زینت: منہ نہ کھلواؤ رشیدہ آپا۔

رشیدہ: کیا مطلب؟

(نگہت آتی ہے)

جمیلہ: چلے گئے بھائی جان، نگہت!

نگہت: چلے جائیں گے ابھی۔

(رُقیہ آتی ہے)

زینت: آؤ رُقیہ! بس تمھاری کسر تھی۔

جمیلہ: معلوم ہوتا ہے کوئی بڑی عجیب و غریب بات... سنانے آئی ہے اور سنانے کے لیے بے تاب ہے۔

رُقیہ: (مسکرا کر) آج ان محترمہ کے حالات معلوم ہو گئے ہیں۔

زینت: (بے چینی سے) نئی ہمسائی کے حالات؟

رُقیہ: اور کیا؟

زینت: کہو تو!

رُقیہ: معاملہ اصل میں یہ تھا کہ اس کا شوہر کسی مقدّمے میں گرفتار ہو کر جیل جا چکا ہے۔ اس نے اپنے والدین اور سسرال پر بار بننا گوارا نہ کیا۔ کسی دفتر میں ملازمت کرنے لگی۔ عزیزوں نے سخت مخالفت کی تو اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئی۔ اب ملازمت کرتی ہے۔ بس یہ بات ہے۔ سنا ہے تعلقات پھر خوشگوار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آج.....

زینت: کیا خوب (بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

رُقیہ: اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

زینت: (زیادہ ہنس کر) اور کیا کیا جائے؟

(رُقیہ، زینت کو گھور کر دیکھتی ہے۔ باقی عورتیں دِل چسپی سے یہ منظر دیکھ رہی ہیں)

رُقیہ: عجب بھونڈا مذاق ہے!

زینت: رُقیہ بہن! کہیں تم پر تو یہ افتاد نہیں پڑی۔ ہمارے بھائی صاحب خیریت سے ہیں نا۔ میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جیل...

رُقیہ: میں کہتی ہوں دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا۔ چپ رہو ہمارے مونھ میں بھی زبان ہے۔

نگہت: تو رُقیہ بہن! کسی دفتر میں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے۔ مالی حالت کمزور ہے۔

رُقیہ: رشیدہ آپا! یہ تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔

نگہت: رُقیہ، ہاں یاد آیا۔ اس کیس کا کیا بنا؟ تمھارے شوہر پر رشوت کا الزام لگایا گیا تھا۔

رُقیہ: سب بکواس، جھوٹ، بہتان۔

نگہت: ویسے ہماری رُقیہ بہن تعلیم یافتہ ہیں۔ دفتر میں ملازمت کر سکتی ہیں۔

رُقیہ: تم پاگل ہو گئی ہو زینت، بالکل پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔

نگہت: میں پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہوں۔ یہ بھی خوب رہی۔ اور تم کون ہو۔ تم سب کی سب اپنی نئی ہمسائی کی شکل میں اپنا ماضی دیکھ رہی ہو۔ اپنے اندیشوں کی پرچھائیں محسوس کر رہی ہو۔ تمھارا ماضی ابھی تک تمھارے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ تمھارے اندیشے دھواں بن کر تمھارے دماغوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس عورت کو تم نے ایک معمّا بنا دیا ہے۔ جب تک میں خود جا کر اس کی باتیں سن نہیں لوں گی، چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ تم نے میرا اضطراب بڑھا دیا ہے۔ میری بے چینی دگنی کر دی ہے۔ میں خود اس کے پاس جاتی ہوں اور اس کی زبانی اس کے حالات سنتی ہوں۔

(زینت اٹھ کر جانے لگتی ہے)

نگہت اور جمیلہ: (ایک ساتھ) زینت!

زینت: میں ضرور جاؤں گی!

نگہت: تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔

رُقیہ: جانے دو اسے۔ جائے گی کہاں!

زینت: کیوں۔ میں جا رہی ہوں۔ ابھی، اسی وقت، اسی لمحے جا رہی ہوں۔

رُقیہ: وہ خیر سے چلی گئی ہے گھر چھوڑ کر۔ جاؤ۔ شوق سے جاؤ۔

(زینت کے قدم رُک جاتے ہیں اور پردہ تیزی سے گرتا ہے)

(پسِ پردہ)

میرزا ادیب (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء)

میرزا ادیب لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام دلاور علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پائی اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ معروف رسالے ''ادبِ لطیف'' کے مدیر رہے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ تمام زندگی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بسر کی۔

میرزا ادیب یک بابی اور ریڈیائی ڈراما نگاری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں: **آنسو اور ستارے، لہو اور قالین، شیشے کی دیوار، فصیلِ شب، پسِ پردہ اور خاک نشین** شامل ہیں۔ وہ اپنے ڈراموں میں عام انسانی زندگی کے تضادات اور تصادم کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان شگفتہ اور رواں ہے اور مکالمہ نگاری میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے۔ آپ کی آپ بیتی **مٹی کا دیا** کے نام سے شائع ہوئی ہے اور خاکے **ناخن کا قرض**۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

الف۔ نئی ہمسائی کے بارے میں رشیدہ نے زینت کو کیا بتایا؟

ب۔ زینت نے جمیلہ کو یہ قصّہ سنایا تو اس نے کیا کہا؟

ج۔ اس ڈرامے میں کس سماجی بُرائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

د۔ کیا نئی ہمسائی کے بارے میں عورتوں کی باتیں درست تھیں؟

ہ۔ اس ڈرامے سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ مجھے تو لگائی بجھائی کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔

ب۔ خیال تھا ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور دنیا کو اپنے لیے جنت بنائیں گے۔

ج۔ تم سب اپنے اندیشوں کی پرچھائیں محسوس کر رہی ہو۔

۳۔ درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں:

کرشمہ　　سنگدل　　تلخی　　بھید　　حادثہ　　سر پھٹول　　اُفتاد　　منڈلانا　　بے چینی　　خوشگوار

۴۔ مندرجہ ذیل جوابات میں سے صحیح کی نشان دہی (✓) سے کریں:

۱۔ میرزا ادیب کس صوبے میں پیدا ہوئے:

الف۔ پنجاب ب۔ سندھ ج۔ بلوچستان د۔ خیبر پختونخواہ

۲۔ میرزا ادیب کی زبان ہے:

الف۔ شگفتہ اور رواں ب۔ نہایت مشکل ج۔ نہایت آسان۔ د۔ کہیں مشکل کہیں آسان

۳۔ ہمسائی کو بچپن سے کیا بننے کا شوق تھا:

الف۔ ایکٹرس ب۔ ڈاکٹر ج۔ شاعر د۔ استانی

۵۔ روز مرّہ بیان کے اس اسلوب اور بول چال کو کہتے ہیں جو اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس کے خلاف استعمال کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات بیان قواعد کی رُو سے درست ہوتا ہے لیکن روز مرّہ کی رُو سے غلط ہوتا ہے۔ مثلاً "اس کی چشم میں درد ہے"، کہنا غلط ہے۔ جب کہ "اس کی آنکھ میں درد ہے" کہنا درست ہے۔ اِسی طرح "وہاں جا کر اس کو کہنا" غلط ہے جب کہ "وہاں جا کر اُس سے کہنا" درست ہے۔ آپ درج ذیل جُملے پڑھیں اور استاد صاحب کی مدد سے روز مرّہ کی غلطیاں درست کریں:

الف۔ بارش برس رہی ہے۔ ب۔ میں نے پشاور جانا ہے۔ ج۔ آئے روز کا جھگڑا اچھی بات نہیں۔ د۔ آپ کا کیا حال چال ہے؟

ہ۔ جھوٹ مارنا بُری عادت ہے۔ ء۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔

سرگرمی

ہر طالب علم اپنی پسند کے کسی ایک موضوع پر مکالمہ لکھے۔

ڈراما نگاری

"ڈراما کی اصل یونانی لفظ "ڈراؤ" ہے جس کا مطلب ہے: "کر کے دکھانا"۔ گویا اس لفظ میں اس صنف کی اساسی خصوصیت آجاتی ہے کہ بقیہ اصناف ادب کے برعکس اسے عملی صورت میں سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے"۔ (ڈاکٹر سلیم اختر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ)

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے قبل یہ بتایا جائے کہ کسی کی عدم موجودگی میں اُس کے خلاف رائے دینے سے کیا اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔
- سبق کے مرکزی خیال کی وضاحت کی جائے۔
- مصنّف کے اُسلوبِ بیان اور زبان کے بارے میں بتایا جائے۔
- ڈراما نویسی میں کردار نگاری کی اہمیت واضح کریں۔
- طلبہ سے کسی گھریلو یا آپس کی بات چیت کا مکالمہ لکھنے کے لیے کہیں یا اُنھیں روزانہ مصروفیات کم از کم ایک ہفتے تک ڈائری لکھنے کے لیے کہیں۔

9 نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- عبارت کو ادبی اور علمی امتیاز کے ساتھ مجازی اور اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھ کر پڑھ سکیں۔
- اپنے تخیل، مشاہدے اور تجربے کو کام میں لا کر پانچ سو سے زائد الفاظ پر مشتمل تخلیقی سطح کا مضمون لکھ سکیں اور کسی بھی ادبی، علمی، موضوع پر درست لب و لہجے اور تلفظ کے ساتھ تقریر کر سکیں۔
- محاورے کے بارے میں جان سکیں اور روزمرہ سے اس کے امتیاز کو واضح کر سکیں۔

پڑھیں

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ ''مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں، نہ ملیں گے''۔ جس طرح یہ صحیح ہے، اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیے کہ ''ماضی ماضی ہے اور حال حال۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے''۔ لیکن خدانخواستہ اگر ان کی ٹکّر ہو گئی تو سمجھ لیجیے دو ہی مصیبتیں پیش آئیں گی جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا مصیبتیں تھیں، ان کو بھی سُن لیجیے۔ واقعات از سر تا پا غلط سہی مگر پڑھنے کی حد تک ان کو سچ جانیے اور یقین کیجیے ورنہ پڑھنے میں خاک مزا نہ آئے گا۔ اگر آپ اس پر تیّار ہیں تو بسم اللہ آگے چلیے ۔

آؤ حضرت تمھیں بھی دکھلائیں　　سیر ماضی کی اس زمانہ میں

سنہ انیس سو (۱۹۰۰ء) کچھ میں، ہم نے تعلیم سے فراغت پائی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک ریاست میں (نام کی جگہ صفر) ہمارے خاندانی تعلّقات تھے۔ اس لیے کالج سے نکل کر سیدھا اُدھر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچے تو کسی نے کہا نوکری کر لو، کسی نے کہا ابھی تعلیم جاری رکھو۔ چوں کہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہوا تھا اور وہاں کی صحبتیں پیشِ نظر تھیں، اس لیے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ صورت بھی خود بخود پیدا ہو گئی۔

اس ریاست میں میرے ایک عزیز، ایک بہت ہی بڑے عہدے پر تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ''ارے میاں! میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ میرا اُن کے ہاں بہت اثر ہے۔ اگر کہو تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لیے کہہ دوں۔ تمھاری تعلیم مفت میں ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسُوخ کے آدمی ہیں۔ واپسی کے بعد تمھیں کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔'' میں نے کہا، ''آپ کو اختیار ہے۔'' دوسرے تیسرے ہی روز انھوں نے مجھے بُلا کر کہا ''لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجیے اور مددگار صاحب کے اسمِ شریف پر لکیر کھینچ دیجیے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ سچّی بات بُری معلوم ہوتی ہے۔ کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

بہر حال دو بجے ہی سے ہم نہا دھو، کپڑے بدل، سیاہ ٹرکش کوٹ، دستار پہن اور بگلوس باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی، دستار سر پر بار ہو گئی۔ اگرچہ ''شملہ بمقدارِ علم'' کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو الگ ہی رہنے دو۔ اُتار کر رکھ دو اور ننگے سر ہی چلے چلو مگر کیا کیا جاتا، وہ نواب صاحب پرانی وضع کے ایسے دلدادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس لیے ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' سمجھ کر اس بار کو اٹھانا ہی پڑا۔ ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچتے اور دستار کو درست کرتے گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھی آگئی۔ آخر خدا خدا کر کے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اُترے، آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم نواب صاحب کی عالیشان اور پر تکلّف کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ تین بج چکے تھے، مگر معلوم ہوا کہ ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں، اس لیے دونوں کے دونوں بلیئرڈ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ چوبدار پر چوبدار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ ہو رہا ہے، اب یہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ خبر آئی تھی کہ کمرے کا رنگ ہی بدل گیا، یا تو ہم دو ہی آدمی بیٹھے تھے یا سارا کمرا آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی اِدھر سے آیا، کوئی اُدھر سے۔ کوئی اِس کمرے سے نکلا، کوئی اُس کمرے سے۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب ان کو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبین کا کیا حوصلہ تھا جو ان سے جھک کر نہ ملتے البتہ مجھ کو دیکھ کر ذرا کھنچتے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا ذرا اوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔

اب تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سُن لیجیے۔ کوٹھی کیا ہے، کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بڑا میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکّر کھاتی ہوئی سیڑھیوں تک آتی ہے۔ سیڑھیوں کے بعد صحن چبوترہ اور صحن چبوترے کے بعد پھر سیڑھیاں ہیں اور یہیں سے کئی منزلہ مردانہ مکان شروع ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں پرانا دقیانوسی سامان بھرا ہوا ہے۔ ان کمروں کے سامنے جو برآمدہ ہے، اس میں چند ٹوٹی پھوٹی کُرسیاں لاوارث حاجت مندوں کے لیے پڑی رہتی ہیں۔ ان کُرسیوں سے مجھ کو بھی واسطہ پڑا ہے۔ اس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ جو بڑی سڑک چکّر کھا کے محل سرا کے دروازے کو گئی ہے، وہ بلیئرڈ روم کے سامنے سے گزرتی ہے اور یہاں اتنی چوڑی ہو گئی ہے کہ اچھا خاصا صحن نکل آیا ہے۔ بلیئرڈ روم کے بالکل سامنے دوسری منزل سے نیچے آنے کا زینہ اور اس کے بائیں طرف اوپر کے بڑے کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھجّا ہے۔ چھجّے کے اوپر نہایت خوبصورت نیچی سی منڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے لیے مکان کا اسی قدر ہی نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر۔ تو ہم سب یہ سُن کر، کہ نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں، کمرے سے باہر نکل آئے اور اس طرح لائن باندھ کر کھڑے ہوئے کہ یہ چھجّہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیئرڈ روم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب۔ ہر شخص کی نظر اس چھجّے پر لگی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ہی چوبدار نے آواز دی ''آداب بجالاؤ۔'' اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے مگر میں نے جُھکنے سے پہلے ایک نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجّے پر کھڑے ہیں مگر بالکل اس طرح کہ گویا فوٹو اُتروا رہے ہیں۔ میں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھے کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکڑ کر کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے:

"I am the monarch of all I survey"[1]

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا:

---

[1] ۔ ترجمہ: میں اس سارے علاقے کا بلا شرکت غیرے بادشاہ ہوں

''جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر میں ہی میں ہوں''

جب اس تسلیمات کے جھگڑے سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو، یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ، تو کس مصیبت میں پڑا۔ چل گھر چل۔ سوچا ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لُطف کا بھی مزا اٹھالوں۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا، ''اوہو! یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں۔'' چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود بخود تعارف کرا دیا۔ مددگار صاحب نے کہا، ''جی ہاں۔'' نواب صاحب مسکراتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ میری تعلیم کا حال پوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے۔ غرض انھی باتوں میں شام ہوگئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ دونوں وقت آیا کیجیے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں۔ اگر یہاں نہ بھی ہوا تو جہاں ہوں گا، چوبدار آپ کو پہنچا دیں گے۔''

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوبدار سے پوچھا کہ نواب صاحب کس طرف سے برآمد ہوں گے۔ اس نے کہا ''میرے ساتھ آیئے۔'' ہم ساتھ ہو گئے۔ اس نے لے جا برآمدے کی انھی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا جن کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوبدار اُدھر سے نکلتا، اس سے پوچھتا کہ بھئی نواب صاحب آج برآمد ہوں گے یا نہیں؟ وہ یہی کہ کر چلا جاتا کہ آپ تشریف رکھیے۔ جب ایک کُرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اُٹھ کر دوسری پر جا بیٹھتا۔ آخر خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اس وقت ایک چوبدار نے آکر کہا ''اب آپ جایئے۔ سرکار محل میں تشریف لے گئے۔ شام کو آیئے گا تو ملاقات ہو گی۔'' کیا بتاؤں کس قدر غصّہ آیا لیکن جز بز ہو کر رہ گیا۔ آکر اپنی جگہ سے اُٹھا اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔

شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا مگر لوگوں کے کہنے سننے پر پھر پہنچا۔ ایک چوبدار نے لے جا کر پھر انھی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہو گی مگر وہاں کون کس کو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بج گئے۔ اس وقت میں نے دل میں کہا ''حضرت اگر یونہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہو گی، چلو بغیر اطلاع ہی پہنچ جاؤ۔ راستہ تو معلوم ہے۔ ہو نہ ہو نواب صاحب اسی طرف ہوں گے جدھر کل تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہو گا بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہو جائیں گے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہو جائیں، تم رُوٹھے، ہم چھوٹے۔'' یہ سوچ کر کُرسی سے اٹھا۔ کمرے میں ہو، بلیئرڈ روم میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آرہی تھی۔ اس آواز کی سیدھ میں چلا۔ دیکھا تو کمرے کے باہر ہی نواب صاحب اور ان کے سب مصاحب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا تسلیمات بجالایا۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہوا تو نواب صاحب مسکرا کر کہنے لگے ''اجی ماسٹر صاحب! آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھ کو تو آپ کا بڑا انتظار رہا۔'' میں نے کہا ''جناب عالی! میں تو صبح کو بھی آیا تھا مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں کی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی، اگر میں خود بغیر اطلاع نہ چلا آتا۔'' یہ سُن کر نواب صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ کہنے لگے: ''آپ آئے تھے اور مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے کیا معنی؟ میں نے تو کل ہی کہ دیا تھا کہ میں جہاں بھی ہوں، آپ کو اطلاع کر دی جائے۔'' میں نے کہا: ''دیکھیے وہ چوبدار صاحب جو پیچھے کھڑے ہیں، انھوں نے ہی مجھے وہاں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر لے جا کر بٹھایا تھا کہ 'ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے'۔ اور وہ جو اُن کے برابر کھڑے ہیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آٹھ دس مرتبہ ان سے کہا مگر انھوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا۔'' جتنے چوبدار تھے، سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے مگر میں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی، چُپکا نہ ہوا۔ ایک چوبدار نواب صاحب کے بہت مونھ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ ہمت کر کے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر کہا: ''سرکار'' مگر میں نے ان کو آگے چلنے نہ دیا اور کہا: ''کیا سرکار، سرکار لگائی ہے۔ کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ صحت فرما رہے ہیں۔ بس خاموش رہو۔ اس طرح باتوں میں دخل دینا تمھارا کام نہیں ہے۔'' وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے ''خاموش'' اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بیچارے سمجھے ہوں گے کہ کہیں یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اُتر آئیں۔ پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر ہنسنے لگے۔ سمجھے ہوں گے کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے مگر اس روز سے چوبداروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری شکل سے گھبراتے تھے۔

علمِ مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا، نہ پہلے کبھی دیکھا، نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے، ریشمی باگ ڈوریں ہاتھ میں لیے ایک خوبصورت گھوڑے کو ملاحظے کے لیے لائے۔ یہ گھوڑا اسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپے میں خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکّر کھلائی۔ کچھ پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کیا اور کہا: ''بھئی عجیب چیز ملی ہے۔'' بس اتنا سننا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی تو نواب صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں میرا پیارا گھوڑا اس نئے گھوڑے سے نہ دب جائے تو انھوں نے کہا: ''یہ سب کچھ سہی مگر ہمارے گھوڑے (نام بتانا گویا سارے راز کا انکشاف کرنا ہے) سے اچھّا تھوڑا ہی ہو سکتا ہے؟'' یہاں تو سب سرکار کے نوکر تھے۔ بیگن کے نوکر تو تھے ہی نہیں، فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے: ''خداوندِ نعمت! بھلا گھوڑوں کے تذکرے میں اس کو کیسے لایا جا سکتا ہے! وہ گھوڑا تھوڑی ہے، وہ تو انسان ہے، انسان!!'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ یار لوگوں کو گفتگو کا سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا، اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ جب کہیں جا کر نواب صاحب کو تسکین ہوئی۔ اس طرف سے ذرا فراغت پائی تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: ''مرزا صاحب! آپ نے اس گھوڑے کے متعلق کچھ نہیں کہا؟'' میں نے عرض کی: ''جنابِ عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنے کے لیے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا ایک ایک پُرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشاءاللہ جب اتنے واقف کار لوگ تعریف کر رہے ہیں تو گھوڑا اچھّا ہی ہوگا۔ اگر سچ پوچھیے تو میں اس تمام گفتگو میں یہ بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے۔'' نواب صاحب یہ سن کر مسکرانے لگے۔ خیر انھی باتوں میں کوئی آٹھ بج گئے اور دربار برخاست ہوا۔

اب دوسرے دن شام کا ذکر سنیے کہ نواب صاحب نے حکم دیا: ''ہمارا نیا گھوڑا لاؤ۔'' سائیس اسی طرح بنا سنوار کر گھوڑے کو لائے مگر بجائے چلنے کے وہ پھُدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اِس سرے سے اُس سرے تک سارے سائیسوں اور کوچوانوں کو لے ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا۔ دوسرے نے سائیس کی لاپروائی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے مونھ اتنی باتیں مگر آخر کار بہ غلبہ آرا یہ تصفیہ ہوا کہ دوسرے گھوڑوں کے سائیسوں نے جل کر اس کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یک قلم موقوف۔ میں نے جو ان غریبوں پر بلاوجہ آفت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ آگے بڑھ کر کہا: ''جنابِ والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا گیا کہ گھوڑا لنگڑا ہے۔ اگر ذرا غور سے گھوڑے کو ملاحظہ فرمایا گیا ہوتا تو کل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا'' میرا یہ کہنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے، سب نے بُرے بُرے دیدوں سے میری طرف دیکھا، لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمّت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر کہیں لپٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا معلوم ہوا، کہنے لگے۔ ''ماسٹر صاحب! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا لنگ کرتا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا؟'' میں نے کہا ''جنابِ عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو ان سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کے بجائے میری مذمّت پر اتر آتے تو میں کہاں ان سے پیچھا چھڑاتا پھرتا۔ وہ بلاتے، پاس بٹھاتے، پان کھلاتے۔ ادھر اُدھر کی غپّیں اڑتیں۔ شعر و سخن کے چرچے رہتے۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علی گڑھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھر میں کیا کیا انتظام ہوئے۔ اس کا علم تو اللہ کو ہے، ہاں باہر جو کچھ لاؤ لشکر جمع کیا گیا، اس کا حال سن لیجیے۔ ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحبزادے صاحب، محل سرا سے باہر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا، ''بادشاہ، لو اب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو، چھانٹ لو، ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد کریں گے۔'' سب سے پہلے گاڑی، گھوڑوں کا انتخاب شروع

ہولہ پڑھنے جارہے تھے پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کیے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمت گار، دو پاؤں دبانے والے، ایک کہانی کہنے والا، دو باورچی، آٹھ سائیس۔ اس طرح خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے۔

اس واقعہ کو تین روز گزر گئے۔ ایک دن، رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخاست ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: "ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لیے علی گڑھ جارہے ہیں۔ آپ بھی دو بجے اسٹیشن پر آجایئے۔" میں نے عرض کی: "عالی جناب! میں نے ابھی تک چلنے کی کوئی تیاری نہیں کی ہے اور نہ میں ایسے فوری حکم کے لیے خود تیار تھا۔ آپ تشریف لے جایئے۔ میں اِن شاء اللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤں گا۔" الغرض یہ تصفیہ ہوا کہ تیسرے روز میں یہاں سے روانہ ہوں اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما رہیں۔

دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ شام کو مددگار صاحب سے ملنے گیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے مگر صاحبزادے صاحب اور ان کا لشکر آگے چلا گیا۔ مددگار صاحب سے مل کر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔ ایک آدھ چھینک آگئی تھی، ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے، اس لیے واپس تشریف لے آئے، دوسرے دن پھر گیا۔ نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحبزادے صاحب کا تار تھا کہ "کالج والوں نے تمام ملازمین اور گاڑی، گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہنا ہے تو صرف ایک اتالیق اور ایک نوکر کے ساتھ آکر رہو ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو۔" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا: "خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ بھلا کیا جانیں کہ نوابوں کے لڑکے کس طرح رہتے ہیں اور کس طرح تعلیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے، گھوڑے دونوں کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحبزادے صاحب کو بُلوا لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کے دشمن بیمار پڑ جائیں۔" میں نے کہا: "میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ؟ نواب بن کر نہیں پڑھا جاتا۔ طالب علم بن کر پڑھا جاتا ہے۔ صاحبزادے صاحب کو اگر نواب صاحب بالکل میرے سپرد کر دیں تو میں دو ہی برس میں دکھا دوں کہ کیا سے کیا ہو گیا؟" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسرا تار آیا۔ لکھا تھا "میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ واپسی کی اجازت دی جائے"۔ میں نے بہتیرا سر مارا مگر میری ایک نہ چلی اور تار دے دیا گیا کہ "فوراً چلے آؤ۔" جب طالب علم ہی نہ رہا تو اتالیق کیسا؟ میں نواب صاحب کو اس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی نہیں گیا۔ مدّتیں گزر گئیں۔ بھول گئے ہوں گے مگر مجھے پرانی اور نئی تہذیب کی یہ ٹکر ہمیشہ یاد رہے گی:

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب
ہم تمھیں یاد کیا کرتے ہیں

(مضامینِ فرحت)

مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء۔۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ ہائی سکول سے حاصل کی۔ بی۔اے کی ڈگری سینٹ سٹیفن کالج، دہلی سے حاصل کی۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے۔ پہلے محکمۂ تعلیم میں کام کیا۔ بعد میں ان کی خدمات محکمۂ عدالت نے حاصل کر لیں، جہاں ترقی کر کے ہوم سیکرٹری ہو گئے۔

فرحت اللہ بیگ نے زیادہ شہرت اپنے مضامین کے سبب پائی۔ ان کا طرزِ تحریر سادہ اور پُر لطف ہے۔ وہ بڑے شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں اور جا بجا مزاح کی چاشنی سے تحریر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے مضامین میں مضامینِ فرحت کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ **دِلّی کا ایک یادگار مشاعرہ، مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی اور مردہ بدست زندہ** ان کے لافانی مضامین میں سے ایک ہے۔

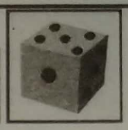

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

الف۔ سبق میں انگریزی کی کس مثل کا ذکر ہوا ہے؟

ب۔ مصنّف نے تعلیم سے فراغت کب پائی؟

ج۔ مصنّف کون سا لباس پہن کر نواب صاحب کے ہاں گئے؟

د۔ مصنّف نے نواب صاحب کے مکان کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے؟

ہ۔ گھوڑا چلنے کے بجائے بُھدکتا ہوا کیوں آیا؟

ء۔ نواب صاحب کا بیٹا علی گڑھ سے کیوں واپس آ گیا؟

ی۔ مضمون نگار نے نواب صاحب کو ان کے بیٹے کی تعلیم و تربیت سے متعلق کیا مشورہ دیا؟

۲۔ درج ذیل الفاظ کے معانی لکھیں:

مِثل　　فراغت　　مصاحبین　　سائیس　　تصفیہ

۳۔ درج ذیل الفاظ کو اپنے جُملوں میں استعمال کریں:

تجویز　　حاجت مند　　بَل آنا　　آداب بجالانا　　تہذیب

۴۔ لُغت کی رُو سے ''محاورہ'' کا مطلب ہے ''بات چیت کرنا''، لیکن اصطلاحاً جب کوئی کلام دو یا دو سے زیادہ الفاظ پر مشتمل ہو اور اپنے مجازی معنی دے تو وہ محاورہ کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''آسمان سے باتیں کرنا'' محاورہ ہے جس کا مطلب ہے، ''بہت اونچا ہونا''۔ اسی طرح ''آنکھیں چُرانا''، ''ٹھوکر کھانا'' بھی محاورے ہیں۔ کیونکہ اِن محاورات میں ''چُرانا'' اور ''کھانا'' اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ آپ سبق میں آنے والے درج ذیل جملوں پر غور کر کے محاوروں کی نشاندہی کریں:

الف۔ سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

ب۔ ایک چوبدار نواب صاحب کے بہت مونھ چڑھے ہوئے تھے۔

ج۔ مصاحبوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔

د۔ گھوڑے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔

ہ۔ میں کہاں ان سے پیچھا چھڑاتا پھرتا۔

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے قبل قدیم اور جدید تہذیب میں فرق بیان کیا جائے اور ہر دو تہذیبوں کی خصوصیات بتائی جائیں۔
- اِس سبق میں مصنّف کے اسلوب نے دلچسپی اور مزاح کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس حوالے سے زبان اور محاورے کے استعمال پر روشنی ڈالی جائے۔ روزمرہ سے اس کے امتیاز کو واضح کر سکیں۔
- مزاح نگاری کے مختلف حربوں اور طریقوں، انداز اور اسالیب کی تفصیل بتائی جائے۔
- مضمون لکھنے اور تقریر کرنے کی مشق کرائیں۔

10 سماج

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مختلف انداز بیان، مثلاً افسانوی، مزاحیہ اسلوب میں امتیاز کر سکیں۔
- کسی نثری تحریر کی فکری و فنی خوبیوں اور نقائص سے آگاہ ہو سکیں۔
- کسی فن پارے کے وضعی، اصطلاحی، مجازی اور کنایاتی معنی تک رسائی ہو سکیں۔
- علم بیان کی بنیادی اصطلاحوں میں سے خاص طور پر استعارے کو اس کی مثالوں سے سمجھ سکیں۔

پڑھیں

بچپن میں بھوتوں پریتوں کی فرضی کہانیاں سننے کے بعد جب سچ مچ کی کہانیاں پڑھیں تو ان میں عموماً ایک مشکل سا لفظ آیا کرتا۔ سب کچھ سمجھ میں آ جاتا، لیکن وہ لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دن... اور آج کا دن، اس لفظ کا پتا ہی نہ چل سکا۔

وہ لفظ ہے ''سماج''۔ یوں تو یہ لفظ آسان سا ہے، اس کے معنی برادری یا معاشرہ وغیرہ ہوں گے لیکن پتا نہیں اس جماعت کے لوگ بستے کہاں ہیں اور کیوں بات بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کو کچھ کرنے نہیں دیتے، کسی کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ نہ جانے اس جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور یہ لوگ کیوں سکون کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ سننے میں آیا، ظالم سماج، خوفناک سماج، مکروہ سماج... سنگدل سماج!

کچھ یُوں معلوم ہوتا جیسے سماج، کوئی بے ہودہ سا آوارہ گرد شخص ہے، جس کا کام دن بھر ظلم کرنا اور لوگوں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں جتنا شیطان سے ڈر لگتا اتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

اس کے بعد ایک اور دماغی تصویر بن گئی اور یہ لفظ بڑے بڑے دِکھائی دینے لگے، سماج کا شکار... سماج کے تیز پنجوں میں حقیر سی جان۔ سماج کے بھیانک مُنھ کا نوالہ۔

کئی سال تک ہمارے لیے سماج ایک ڈراؤنا جانور رہا، جو اونٹ کی طرح بے تُکا، رِیچھ کی طرح مکلد اور بھدّا اور چیتے کی طرح خوفناک تھا۔ کوئی پوچھے کہ یہ اونٹ ریچھ وغیرہ اکٹھے کیسے ہو گئے؟ بس یونہی ہو گئے۔ لڑکپن ہی تو تھا اور پھر سماج کوئی سادہ سی چیز تو تھی نہیں۔ خیر کتنے ہی دنوں ہم سماج کو خوفناک درندوں میں گنتے رہے۔

اس کے بعد ذرا عقل مند ہوئے۔ اب سماج پر ایک نقّاد کی طرح غور کیا تو چند اور الفاظ کھٹکنے لگے۔ سماج کے ٹھیکے دار... سماج کے اجارہ دار۔ نتیجہ جو نکلا تو افسوس ہوا کہ اب تک سماج کو بالکل غلط سمجھتے رہے۔ سماج تو ایسی چیز ہے جس کا ٹھیکہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ کوئی تجارتی جنس ہو گی یا شاید کاروباری چیزوں میں سے کچھ ہو۔ بہر حال ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ سماج کا ٹھیکہ لینا آسان نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں، کیونکہ بچہ بچہ ان ٹھیکے داروں کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ ساری خلقت ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہوئی ہے۔

کتنے دنوں ہمیں یہی تلاش رہی کہ کسی سماج کے ٹھیکے دار کا بغور مطالعہ کریں۔ بازاروں میں تلاش کی، گلی کوچوں میں پھرے، ہر قسم کے ٹھیکے دار دیکھے... کوئلے کے، لکڑی کے، عمارتوں کے اور نہ جانے کس کس چیز کے... لیکن اس قسم کا ٹھیکے دار کہیں نہ ملا۔ سیانے لوگوں سے کہا کہ آپ ہی مشکل آسان کر دیجیے، لیکن کوئی مدد پر آمادہ نہ ہوا۔ پھر ایک خاتون سے جن کے ہر افسانے کے ہر صفحے پر ہر پانچ چھ سطروں کے بعد سماج کا لفظ آتا تھا، ملنے گئے اور بڑی عاجزی سے کہا کہ محترمہ!

آپ کو تو ان ٹھیکے داروں کا اتا پتا معلوم ہوگا۔ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کو اس خاکسار سے ملادیں تو ایک بوجھ میرے سینے سے اُتر جائے، لیکن وہ یہی سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

شاید سماج اُس طاقت کا نام ہے، جو کسی شخص کو اپنا واجب نا واجب مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ لوگوں کو فوراً امیر ہونے سے روکتی ہے۔ معمولی شکل و آمدنی والے عاشقوں کی محبّت میں حائل ہوتی ہے۔ ایک اَن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے۔ کسی کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا یا کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھے، تو بجائے اصل وجہ سمجھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصوروار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو مونھ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی کمزور ہوا، تو کہے گا کہ یہ سماج کی برائی ہے اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا، تو بھی سماج کو ہی کوسا جائے گا۔ نالائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی کہ "خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے۔" "یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں کر۔" یا "پرماتما نے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا۔" اور دعائیں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔ "پیسہ دیتا جا بابا! خدا تجھے سماج سے بچائے۔" "یا میرے اللہ! مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو۔" وغیرہ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا لکھنے والوں میں بیشتر تعداد کمزور، چڑچڑے اور غمگیں حضرات کی ہے۔ تندرست اور ہنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سنا گیا۔ شاید وہ جانتے ہی نہیں کہ سماج کس جانور کا نام ہے اور اگر کوئی ان سے سماج کی برائیاں کرنے لگے تو وہ اسے اتنی سی اہمیت نہیں دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ سماج کے متعلق سوچتے رہنا ایک بیماری ہو جس کا تعلق خون کی کمی، اعصاب کی کمزوری اور ہاضمے کی خرابی سے ہوتا ہو۔ ایسی بیماری اس وقت تک رفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات دور نہ کی جائیں اور اگر اس مرض کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرّے ذرّے میں اسے سماج کی کرشمہ سازیاں نظر آتی ہیں... رنگ رنگ کے پھول دیکھ کر اسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں۔ سوکھے ہوئے پتّوں کو دیکھ کر کلیجہ مونھ کو آتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوؤں کو دیکھ کر غمگیں ہو جاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں؟ کسی کو ہنستے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا ہے اور یوں مونھ بناتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ "ہنستا ہے بے؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے!" اسے خواب بھی عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں، جیسے سارا ملک ایک بہشت ہے جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ ہیں، نہ صحرا ہیں، نہ دریا، نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راستہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا وطن ہے۔ نہ اونچی عمارتیں ہیں نہ جھونپڑیاں۔ جدھر نظر جاتی ہے ایک منزلہ کوارٹر نظر آتے ہیں۔ آدمیوں میں ذات پات کی تمیز مٹانے کے لیے انھیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ سب کے سب ایک قد کے ہیں، ایک رنگ ہے اور ایک جیسے لباس۔ شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس، نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔

کارخانوں میں مزدوروں کا نام و نشان تک نہیں۔ مشینیں خود بخود چل رہی ہیں اور جو کام ایسے تھے جن کے لیے مزدوروں کی اشد ضرورت تھی وہ بند کر دیے گئے ہیں۔

پتا نہیں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہو جائے تب بھی سماج کو کوسنے والے خوش رہیں گے یا نہیں؟ غالباً نہیں! شاید اس قسم کے بیمارِ سماج حضرات کا علاج... لوہے کا ٹانک، مچھلی کا تیل، فروٹ سالٹ، ورزش اور تبدیلی آب و ہوا ہے۔ بہتر ہوگا اگر ان کے ٹانسل نکلوا دیے جائیں اور خراب دانت بھی! ان سے زبردستی ورزش کرائی جائے اور انھیں ہنس مکھ حضرات کی صحبت میں رکھا جائے۔ اِفاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت برقرار رکھیں، مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے۔

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ سماج کا مذاق بہت پرانا ہو چکا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں بھی ہے) اس کی وہ مٹّی پلید ہوئی ہے، جس کی انتہا نہیں۔ اب مارے شرم کے اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ وہ پشیمان ہے، آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے، اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں، اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں، وہ سچے دل سے معافی کا خواستگار ہے، کیا آپ اسے معاف نہیں کریں گے؟ اسے ضرور معاف کر دیجیے اور اس کا ثبوت اس صورت میں مل سکتا ہے کہ افسانوں میں غریب سماج پر مزید لعنت ملامت نہ کی جائے، بلکہ اسے، اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ افسانوں میں خودکشی

کے واقعات ذرا کم ہو جائیں۔ پریم کے متوالے، اگر پریم کر کے ضرور ثواب لوٹنا چاہتے ہوں، تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی ذات پات میں محبّت کیا کریں اور محبّت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرمالیا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکے دار! سو، جب سماج میں وہ بات نہ رہے گی تو ان کی ٹھیکے داری کیا خاک چلے گی؟ سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا، خود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اللہ! آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجیے۔

(شگوفے)

شفیق الرحمٰن (۱۹۲۰ء۔۲۰۰۰ء)

شفیق الرحمٰن، مشرقی پنجاب کے ضلع رُہتک کے قصبے کلانور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام راؤ عبدالرحمن تھا، جو محکمہ آب پاشی میں انجینئر تھے۔ پانچویں جماعت تک تعلیم سنٹرل مسلم راجپوت ہائی اسکول کلانور سے حاصل کی۔ سٹیٹ ہائی اسکول بہاولنگر سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج رہتک سے ایف۔ ایس سی اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا۔ اس کے بعد فوج کی ملازمت اختیار کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران، مختلف محاذوں پر بحیثیت ڈاکٹر خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد طب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈھائی سال برطانیہ میں بھی رہے۔

شفیق الرحمٰن نے ایک افسانہ نگار اور مزاح نگار کے طور پر شہرت حاصل کی۔ اُن کی کتابوں کی تعداد گیارہ ہے جن میں **کرنیں، شگوفے، مدّوجزر، حماقتیں، مزید حماقتیں، اور دجلہ** وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شفیق الرحمٰن کا اسلوبِ بیان نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ وہ زندگی کے عام واقعات میں بھی مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

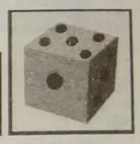

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

الف۔ مصنّف کو بچپن میں ''سماج'' کے لفظ کا کیا مفہوم سمجھ میں آیا؟

ب۔ ''سماج'' کے لفظ پر نقّاد کی طرح غور کرنے سے کیا بات سامنے آئی؟

ج۔ مصنّف نے خاتون افسانہ نگار سے کیا بات پوچھی؟

د۔ سماج کے بارے میں زیادہ سوچنے والوں میں بیشتر تعداد کن لوگوں کی ہے؟

ھ۔ سماج کو کوسنے والوں کا کیا علاج تجویز کیا گیا ہے؟

۲۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ یا میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو۔

ب۔ بچپن میں جتنا شیطان سے ڈر لگتا اتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

ج۔ افاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت برقرار رکھیں، مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے۔

۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

مکلد	دل گردے کا کام	لوہے کے چنے چبانا	خون کا پیاسا	مذاق
مسرور	خون کھولنا	مبادا	پشیمان	خواستگار

۴۔ مندرجہ ذیل جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی (✓) سے کریں:

۱۔ شفیق الرحمن

الف۔ رہتک کے قصبے کلانور میں پیدا ہوئے۔

ب۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔

ج۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔

د۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

۲۔ شفیق الرحمن زندگی کے عام واقعات میں کون سا پہلو تلاش کرتے ہیں؟

الف۔ تنقید کا

ب۔ مزاح کا

ج۔ سائنس کا

د۔ مذہب کا

۵۔ مندرجہ ذیل فقروں کو درست کریں:

الف۔ سماج کا ٹھیکا لینا بڑے دل کلیجے کا کام ہے۔

ب۔ ساری خلقت ان کے پیچھے ہاتھ جھاڑ کر پڑی ہوئی ہے۔

ج۔ جب کسی کو بخار چڑھے گا تو مونھ بگاڑ کر کہے گا، یہ سماج کا قصور ہے۔

د۔ سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر معدہ، مونھ کو آتا ہے۔

ہ۔ کوئی غریب سماج پر مزید لعنت وغیرہ نہ کی جائے۔

سرگرمی

اگر کوئی لفظ اپنے مجازی معنوں میں اِس طرح استعمال ہو کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق موجود ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ اِستعارہ کے لغوی معنی اُدھار لینے کے ہیں۔ مثلاً

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

"چراغ" اِستعارہ ہے ایسے شخص کے لیے جو روشن دِماغ اور ذہین ہو۔

ارکانِ اِستعارہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مستعار لہ:- وہ شخص یا چیز جو مستعار لی جائے۔ اُوپر کے شعر میں روشن دِماغ شخص مستعار لہ ہے۔

۲۔ مستعار منہ:- جس سے لفظ یا صفت مستعار لی جائے۔ اُوپر کے شعر میں "چراغ" مستعار منہ ہے۔

۳۔ وجہِ جامع:- وہ خصوصیت جس وجہ سے کوئی لفظ مستعار لیا جاتا ہے اُوپر کے شعر میں روشن دماغی وجہ جامع ہے۔

مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں مندرجہ ذیل فقرے میں سے مستعار لہ، مستعار منہ اور وجہِ جامع کی نشاندہی کریں:

کئی سال تک ہمارے لیے سماج ایک ڈراؤنا جانور رہا، جو اونٹ کی طرح بے تُکا، ریچھ کی طرح مکلا اور بھدّا اور چیتے کی طرح خوفناک تھا۔

ہدایات برائے اُساتذہ

- سبق خوانی سے پہلے یہ بتایا جائے کہ "سماج" کا اصل مفہوم کیا ہے اور سبق میں یہ کس تناظر میں استعمال ہوا ہے؟
- سبق میں مصنف نے مرکبات، محاورات اور تشبیہات کے ذریعے مزاح کی صورت پیدا کی ہے۔ اِس حوالے سے سبق کی تفہیم کرائی جائے۔
- تشبیہ کے حوالے سے استعارے کی مزید امتیازی وضاحت کی جائے۔

11

کار بکاؤ ہے

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کسی مزاحیہ تحریر کے حسن و قبح کا جائزہ لے سکیں۔
- کسی تحریر کے مرکزی خیال، اہم نکات، فکری و معنوی خوبیوں کو بیان کر سکیں۔
- کسی تحریر کا خلاصہ اور تشریح لکھ سکیں۔
- ذو معنی الفاظ کی پہچان پیدا کر سکیں اور انھیں بخوبی استعمال کر سکیں۔

پڑھیں

ہم سے پہلے بھی کوئی صاحب گزرے ہیں جنھوں نے بیٹھے بٹھائے بکری پال لی تھی اور پھر عمر بھر اس کے زانو پر سر رکھ کر مِنمِناتے رہے تھے۔ ہمیں غیب سے یہ سوجھی کہ اتفاق سے ولایت جا رہے ہیں، کیوں نہ وہاں سے نئی کار لائی جائے! یعنی کیوں نہ جانے سے پہلے پرانی کار بیچ دی جائے! اور یہ سوچنا تھا کہ جملہ اندیشۂ شہر کو لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا اور کار بیچنا شروع کر دی۔ بوٹی بوٹی کر کے نہیں، سالم!

ہمارے کار فروشی کے فعل کو سمجھنے کے لیے کار سے تعارف لازم ہے۔ یہ کار ان کاروں میں سے نہ تھی جو خود بِک جاتی ہیں۔ اس متاعِ ہنر کے ساتھ ہمارا اپنا بکنا بھی لازم تھا، یعنی اس کار کے بیچنے کے لیے ایک پنج سالہ منصوبے کی ضرورت تھی، لیکن ہمارے پاس صرف تین دن تھے کہ چوتھے روز ہم نے فرنگ کو پرواز کر جانا تھا، سو ہم نے ازراہِ مجبوری ایک سہ روزہ کریش (1) پروگرام بنایا جس کا مختصر اور مقفّٰی لُبِّ لُباب یہ تھا: آج اشتہار، کل خریدار، پرسوں تیس ہزار! سو ہم نے اشتہار دے دیا۔

دوسری صبح اشتہار کے جواب میں ٹیلیفون آیا:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔"

اس متشرّع سلام کے جواب میں ہم نے صرف وعلیکم السّلام کہا، جو بہت ناکافی محسوس ہوا۔ ہمیں ذرا شک سا تھا کہ وعلیکم السّلام کے ساتھ بھی برکاتہ، وغیرہ لگ سکتے ہیں یا نہیں، ورنہ جی تو چاہا کہ سلام کا دُمدار ستارہ بنا کر پیش کریں۔ اتنے میں اُدھر سے آواز آئی:

"بندہ پرور، یہ کار کا اشتہار آپ نے دیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کس ساخت کی ہے؟"

"فوکس ویگن ہے جناب، آج کل بڑی مقبول ہے؟"

"بجا فرمایا آپ نے، کون سا ماڈل ہے؟"

"ایسا پرانا نہیں، نئے ماڈل سے ملتا جلتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے کس سال کی ساخت ہے؟"

1۔ Crash بمعنی فوری

اب ساخت تو یہ دس سال پہلے کی تھی لیکن جواب میں یوں کھلّم کھلا سچ بولنا ہمیں موافق نہ تھا، ادھر جھوٹ بولنا بھی ناواجب تھا۔ معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ خریدار کے شرعی رجحانات کے پیشِ نظر کار کی تاریخ پیدائش سن عیسوی کی بجائے سالِ ہجری میں بتائی جائے۔ شاید شعائرِ اسلام کے احترام میں مزید موشگافی نہ کرے۔ بدقسمتی سے ہمیں موجودہ سالِ ہجری کا صحیح علم نہ تھا۔ کچھ اندازہ سا تھا، اسی سے آٹھ سال منہا کر کے کہا:

''قبلہ ۱۳۷۷ ہجری کی ساخت ہے۔''

''اَلحَمدُلِلّٰہ آپ تو بڑے صالح مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں! تو آپ نے فرمایا ۱۳۷۷ ہجری۔ موجودہ سالِ ہجری ہے ۱۳۹۰۔ گویا تیرہ سال پہلے کا ماڈل ہے؟''

ہم اپنے پھیلائے ہوئے دامِ تزویر میں پھنس گئے تھے۔ بہر حال ہم نے پھڑپھڑا کر نکلنے کی کوشش کی۔ یعنی جب ہجری کو آلۂ کار نہ بنا سکے تو سیکولر پینترا بدلا اور کہا:

''جناب معاف فرمائیے گا۔ ہجری حساب کچھ ٹھیک نہیں بیٹھ رہا۔ دراصل یہ صرف دس سال پہلے کا ماڈل ہے۔''

''دس اور تیرہ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کتنے میل کر چکی ہے؟''

ہمیں اسی سوال کا ڈر تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ دس سال میں اگر ہماری کار ادھر اُدھر چلنے کی بجائے خطِ مستقیم میں چلتی رہتی اور تیر بھی سکتی تو بحرالکاہل کے رستے دنیا کے چار چکّر کاٹ چکی ہوتی۔ اس کا سپیڈو میٹر ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل بتاتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ع نکل گیا تھا وہ کوسوں دیارِ حرماں سے، اور اس حقیر کرۂ ارض کا محیط زبوں تو فقط پچیس ہزار میل ہے اور اگر اُڑ بھی سکتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب نیل آرمسٹرانگ چاند پر اترتے تو پہلی چائے غریب خانے پر نہ پیتے۔ الغرض ہماری کار اب، دشتِ امکاں عبور کرنے کے بعد تمنّا کا دوسرا قدم تول رہی تھی مگر افسوس کہ ہمارے گاہک کو کار کی ان ماورائی صفات میں دلچسپی نہ تھی، چنانچہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کتنے میل کر چکی ہے، زبان میں رعشہ پیدا ہونے لگا۔ بہر حال ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا:

''تقریباً ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل۔''

ہمیں یقین تھا کہ یہ سن کر یا تو اپنا فون توڑ دیں گے یا گریبان پھاڑ ڈالیں گے، لیکن خلافِ توقّع ادھر سے توڑ پھوڑ کی کوئی آواز نہ آئی، بلکہ ایک امید افزا سوال سنائی دیا:

''کتنی قیمت ہے؟''

''تیس ہزار۔''

یہ ہم نے آدھے سانس میں کہا اور کامیابی سے اُچھو کو روکا۔ ادھر سے ان صاحب کی آواز آئی:

جناب بندہ... آپ کی کار دس سال پرانی ہے۔ ایک کم ایک لاکھ میل چل چکی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق حالت اچھی ہے۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ تین ہزار روپے قبول فرمائیے گا؟''

''کیا فرمایا آپ نے؟''

یہ جملہ ہمارے مونھ سے اضطراراً نکلا تھا، ورنہ ہم نے تین ہزار کی پیشکش اچھی طرح سن اور سمجھ لی تھی۔ فقط ہمارے دل میں ایک فوری قہر نے کروٹ لی تھی۔ وہی قہر جو کبھی پطرس کے دل میں اُبھرا تھا جب خدا بخش کے ساتھی نے ان کی تاریخی سائیکل کی قیمت چند ٹکے تجویز کی تھی اور پطرس نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا:

''او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے انسان! مجھے اپنی توہین کی تو پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کروں گا۔'' ہمارے غیر ارادی سوال کے جواب میں آواز آئی:

''میں نے عرض کیا تھا تین ہزار... لیکن آپ کو بہتر قیمت مل سکے تو بڑے شوق سے دوسری جگہ بیچ دیں۔ ویسے زحمت نہ ہو تو میری پیش کش بھی کسی کونے میں نوٹ کر لیں۔ میرا فون نمبر یہ ہے اور میرا نام عبدالغفور ہے۔ خاکسار کو مولوی عبدالغفور کہتے ہیں۔''

تو یہ مولوی تھے۔ جبھی تو فرفر ہجری کی عیسوی بنالی تھی۔ بہر حال ہم نے اپنے سارے غصّے کا ایک فقرہ بنا کر مولوی صاحب کو پیش کیا:

''آپ سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟''

جواب میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی اور پھر آہستگی سے فون بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک اور خریدار کا انگریزی بولتا ہوا فون آیا؟

''چھوٹا والا اشتہار موٹر کے بارے میں آپ لوک دیا؟''

''جی ہاں، میں نے ہی دیا ہے۔''

''کون والا کار ہے؟''

''فوکس ویگن والا۔''

''اس میں ریڈیو ہے؟''

''جی نہیں۔''

''یہ تو بڑا DRAWBACK[1] ہے۔''

ہم سمجھ گئے یہ اینگلو ورنیکلر صاحب محض ٹیلی فون قریب ہونے کی وجہ سے گاہک بن بیٹھے ہیں اور مطلب کار خریدنا نہیں، خریدنے کا سواد لینا ہے۔ عرض کیا:

''جناب اس کار کا بڑا نقص یہ نہیں کہ ریڈیو نہیں رکھتی بلکہ یہ رولز رائس نہیں۔''

''فوکس ویگن میں بھی تو ریڈیو لگ سکتا ہے۔''

''لگنے کو تو اس میں شہد کا چھتّا بھی لگ سکتا ہے، لیکن خاکسار کی کار میں یہ ایکسٹرا فٹنگ نہیں۔ گڈ بائی۔''

ایک دو اور فون بھی آئے لیکن کار کی عمرِ رفتہ اور سفرِ گزشتہ کا ذکر آیا تو بامقصد گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ شام کی صبح ہوئی۔ ٹیلی فون ہمارے پہلو میں پڑا تھا لیکن چپ۔ سامنے آخری شب تھی، یعنی پروازِ یورپ میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ ہم نے سوچا اگر کار نہ بکی اور اس عالمِ پیری میں اسے تین ماہ گیراج میں گزارنے پڑ گئے تو جوڑوں کے درد کا شکار ہو جائے گی اور پھر شاید کوئی مولوی غفور بھی میسّر نہ آئے۔ چلو، مولوی صاحب سے ہی رجوع کریں، لیکن فون اٹھایا تو ساتھ ہی مولوی صاحب کی ہنسی یاد آئی۔ سوچا، سُبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو، مگر اندر سے آواز آئی کہ میاں، غالب کا پرابلم تمھارے پرابلم سے سراسر مختلف تھا۔

وہ عشق کا معاملہ تھا۔ یہ تجارت کی بات تھی، بے تکلّف فون کرو۔ ہم نے بے تکلّف مولوی صاحب کا نمبر ملایا اور سلام اور رحمتیں اور برکات بھیجنے کے بعد کہا:

''مولانا ساڑھے تین ہزار میں کار آپ کی ہے۔ چاہیں تو آج ہی لے جائیں۔''

تین پر ساڑھ کا اضافہ محض مولوی صاحب کی فتح کو جزوی شکست دینے کی خاطر تھا۔ لیکن قاری محترم، قصّہ کوتاہ، اسی شام مولوی صاحب ایک سو کم تین ہزار میں کار لے گئے۔ ایک سو کم اس لیے کہ بقول مولوی صاحب کی پچھلی بات چیت کے بعد کار چند قدم چل کر اور بوڑھی ہو چکی تھی اور کچھ یہ بھی کہ مولوی صاحب کی خودی ہماری خودی سے ٹکرا کر ذرا زیادہ پائیدار نکلی تھی۔

(بزم آرائیاں)

کرنل محمد خان (۱۹۲۰ء۔۲۰۰۱ء)

کرنل محمد خان، ضلع چکوال کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۰ء میں فوج میں کمیشن لیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے عسکری زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں رہے۔

کرنل محمد خان نے اُردو کے صاحبِ طرز ادیب اور مزاح نگار کے طور پر شہرت حاصل کی۔ ان کی پہلی کتاب **بجنگ آمد** ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی دیگر کتابیں **بسلامت روی** اور **بزم آرائیاں** بھی ان کے مخصوص اُسلوب اور اندازِ بیان کے سبب پسند کی گئیں۔

کرنل محمد خان کا اندازِ بیان سادہ، شگفتہ اور تاثیر کا رس لیے ہوئے ہے۔ ان کے ہر جملے پر کلیوں کی طرح تبسم پھوٹنے لگتا ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی ظرافت کے رنگوں سے نکھر آتی ہے۔

---

[1] یعنی خرابی

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں:

الف۔ مصنّف کو پرانی کار بیچنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ب۔ مصنّف نے کار بیچنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

ج۔ مصنّف نے کار کا ماڈل سنِ عیسوی کے بجائے سنِ ہجری کیوں بتایا؟

د۔ کار کی قیمت بتاتے ہوئے مصنّف کی کیا کیفیّت تھی؟

ہ۔ گاہک نے مصنّف کو کتنی رقم کی پیش کش کی؟

و۔ مصنّف نے اتنی کم قیمت بتانے پر گاہک کو کیا مشورہ دیا؟

ز۔ مصنّف نے معمولی قیمت پر کار کا سودا کیوں قبول کر لیا؟

ح۔ اس سبق کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

الف۔ یہ سوچنا تھا کہ جملہ اندیشہ شہر کو لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا۔

ب۔ چوتھے روز ہم نے فرنگ کو پرواز کر جانا تھا۔

ج۔ ہم نے ایک سہ روزہ کریش پروگرام بنایا۔

د۔ اس متشرّع سلام کے جواب میں ہم نے صرف وعلیکم السّلام کہا۔

ہ۔ جی تو چاہا کہ سلام کا دمدار ستارہ بنا کر پیش کریں۔

و۔ شاید شعائرِ اسلام کے احترام میں مزید موشگافی نہ کرے۔

ز۔ ہم اپنے پھیلائے ہوئے دامِ تزویر میں پھنس گئے۔

ح۔ افسوس کہ ہمارے گاہک کو کار کی ماورائی صفات میں دلچسپی نہ تھی۔

ط۔ یہ جملہ ہمارے مونھ سے اضطرار اً نکلا تھا۔

ی۔ کار چند قدم چل کر اور بوڑھی ہو چکی تھی۔

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کریں :

متاعِ ہنر　　لُبِّ لُباب　　دامِ تزویر　　کُرۂ ارض　　محیطِ زبوں　　عمرِ رفتہ　　بے ہودہ گفتاری

۴۔ صحیح جوابات کی نشاندہی (✓) سے کریں:

I. سبق "کار بکاؤ ہے" کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

الف۔ بزم آرائیاں　　ب۔ بجنگ آمد　　ج۔ بسلامت روی

II. سبق کار بکاؤ ہے کس کی تحریر ہے؟

الف۔ کرنل اسد محمد خان　　ب۔ شفیق الرحمان　　ج۔ سید ضمیر جعفری

III. کرنل محمد خان کی تحریریں کس طرح کی ہیں؟

الف۔ انتہائی سنجیدہ　　ب۔ فلسفیانہ　　ج۔ طنزیہ اور مزاحیہ

IV. مصنف کو کار کتنی قیمت میں فروخت کرنا پڑی؟

الف۔ ایک سو کم تین ہزار روپے　　ب۔ دو سو کم تین ہزار روپے　　ج۔ پانچ سو کم تین ہزار روپے

V. مصنف کے مطابق کار کی ساخت کتنے برس قبل کی تھی؟

الف۔ سات برس　　ب۔ نو برس　　ج۔ دس برس

VI. فروخت کی جانے والی کار کتنے میل چل چکی تھی؟

الف۔ ننانوے ہزار نو سو ننانوے　　ب۔ پچاس ہزار پانچ سو　　ج۔ اسی ہزار آٹھ سو آٹھ

VII. کار فروخت کرنے کے لیے مصنف کے پاس کتنے دن تھے؟

الف۔ تین　　ب۔ چار　　ج۔ پانچ

VIII. مصنف نے ٹیلیفون کرنے والے کو کار کی کیا قیمت بتائی؟

الف۔ بیس ہزار روپے ب۔ تیس ہزار روپے ج۔ چالیس ہزار روپے

۵۔اُردو میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ معنی رکھتے ہیں۔ایسے الفاظ کو ذو معنی الفاظ کہا جاتا ہے۔ایسے الفاظ کا استعمال ادبی تحریروں اور اشعار میں کیا جاتا ہے جس سے ان تحریروں اور اشعار میں ایک خاص حسن پیدا ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا لطف محسوس کرتا ہے۔مثلاً ذیل میں دیئے گئے چند ذو معنی الفاظ دیکھیں:

''آن''	کے دو معنی ہیں:	عزت اور لمحہ
''عرض''	کے دو معنی ہیں:	گزارش اور چوڑائی
''مہر''	کے دو معنی ہیں:	محبت اور سورج

آپ اپنے استاد صاحب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کے دو دو معنی لکھیں:

بیت چاہ ہَوا ادا کار

۶۔مندرجہ ذیل واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

صاحب اشتہار رجحانات آلہ صفات توقع صدمہ

نقص برکات

سرگرمی

مصنّف نے اس سبق میں پطرس کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی چند سطریں درج کی ہیں۔آپ لائبریری یا اپنے استاد صاحب سے اس مضمون کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس کا مطالعہ کریں اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات درج کریں۔

طنز

''زندگی کی مضحک، قابل گرفت اور تنفر انگیز پہلوؤں پر مخالفانہ اور ظریفانہ تنقید اصطلاح میں طنز کہلاتی ہے۔(ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، **کشاف تنقیدی اصطلاحات**)

مزاح

''جب ظرافت میں صرف خوش طبعی ہو تو وہ مزاح ہے''۔(پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ)

ہدایات برائے اُساتذہ

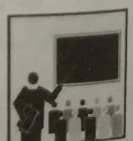

- سبق خوانی کے دوران میں لہجے کے اُتار چڑھاؤ سے مختلف کیفیّتوں کو نمایاں کیا جائے۔
- مصنّف کے اسلوب اور زبان کے برتاؤ پر روشنی ڈالی جائے۔
- مصنّف کا موجودہ دور کے مزاح نگاروں سے موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مصنّف کی انفرادیت کیا ہے؟
- ایسے چھوٹے چھوٹے تخلیقی جملے لکھنے کی مشق کرائی جائے جن میں ایک لفظ بدلنے سے صورتِ حال بدل جائے۔

12 خطوط بنام مدیر

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اخبارات اور رسائل کے انداز میں لکھ سکیں۔
- صحت وصفائی کے اصولوں کی پاسداری کی طرف اخبار کے ذریعے یا براہ راست ذمہ دار افسر کی توجہ مبذول کروا سکیں
- ادبی، صحافتی یا رسمی انداز میں بیان میں امتیاز کر سکیں۔
- صحافیانہ یا علمی تحریروں کو علامات اور مخصوص اصطلاحات کے ادراک کے ساتھ پڑھ سکیں۔

پڑھیں

اخبارات اور جرائد میں مدیر کے نام خطوط کی اشاعت ایک مسلّمہ صحافتی روایت ہے۔ جس طرح اخبار یا رسالے کے مدیر کو ہر طرح کے معاملات اور مسائل پر رائے دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ہر شہری یعنی اخبار کے قاری کو بھی مدیر کی رائے، کسی معاملے میں اخبار کی پالیسی، اخبار کے تمام یا بعض مندرجات سے اختلافات کرنے کا حق ہے اور اگر قاری اپنے اس اختلافات کو تحریری صورت میں اخبار تک پہنچائے تو اخبار کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس کو شائع کرے۔ اگر کوئی قاری اخبار کی پالیسی، اس کے بعض مندرجات، یا کسی معاملے میں اس کے موقف سے متفق ہے اور اس امر کا اظہار بھی تحریری طور پر کرتا ہے تو اسے بھی اخبار کے کالموں میں جگہ ملنی چاہیے۔ صحافت کے ابتدائی دور میں اخبارات ورسائل میں ''قارئین کے خطوط''، ''قارئین کی آرا'' اور ''مراسلات بنام مدیر'' قسم کے مندرجات عموماً تعریفی نوعیت ہی کے ہوتے تھے۔ لیکن عام ہونے، لوگوں کا شعور بیدار ہونے اور قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے سے اخبارات کے مندرجات اور مدیروں کی آرا کو بھی اپنے کالموں میں اسی طرح جگہ دی جس طرح موافق آرا کو دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کی آرا کی اشاعت ایک مستقل روایت بن گئی۔

اب تعلیم عام ہو چکی ہے۔ بعض ملکوں میں خواندگی کا تناسب سو فیصد ہو چکا ہے۔ باقی دوسرے ملکوں میں بھی خواندگی کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم وغیرہ نے نیم خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کو بھی مکمل لاعلمی کے گنبد سے باہر نکال لیا ہے اور وہ بہت کچھ جاننے بوجھنے لگے ہیں۔ اخبارات کی اشاعت بہت بڑھ گئی ہے، چنانچہ قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے اور ان کو ملکی و بین الاقوامی معاملات و مسائل سے زیادہ آگہی حاصل ہونے سے اخبارات کے مندرجات، ان کی پالیسیوں اور آرا سے اتفاق اور اختلاف کرنے والوں کی تعداد بھی بہت ہو گئی ہے۔ اب بہت سے ایسے قارئین بھی موجود ہیں جو صرف اخبارات کے مندرجات ہی پر رائے زنی نہیں کرتے بلکہ عام معاملات و مسائل کے متعلق بھی اپنی آرا اور خیالات اخبارات کو بھیجتے رہتے ہیں۔ کوئی تو ملک کے تہذیبی و معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کرتا ہے اور کوئی لسانی مسئلے کے متعلق رائے دیتا ہے۔ اگرچہ اب بھی بیشتر قارئین مدیر کے نام اپنے مراسلات میں خبروں، آرا، یا واقعات و حالات پر اظہار رائے کرتے ہیں جو اخبار میں چھپتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے معاملات و مسائل پر بھی لکھتے رہتے ہیں جو ان اخبارات میں زیر بحث نہیں ہوتے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ اس دور میں ''خطوط بنام مدیر'' کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ زیادہ تر اخبارات اس لیے قارئین کے خطوط ادارتی صفحات پر شائع کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں اور دوسرے نو آزاد ترقی پذیر ملکوں میں خطوط بنام مدیر نے کچھ مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ ان ملکوں میں دورِ غلامی کی خرابیاں مثلاً بد عنوانی، دفتریت، اہل کاروں کی نااہلی، فرض ناشناسی اور معاشرتی فرائض سے غفلت وغیرہ نئی یا بدلی ہوئی صورتوں میں اب بھی موجود ہیں اس لیے لوگ انفرادی اور اجتماعی مسائل کی نشاندہی اور حل کے لیے اخبارات سے رجوع کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں یہ خطوط روزانہ خاصی تعداد میں چھپتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ دوسرے مندرجات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی اہمیت بڑھتی گئی۔ خبروں کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ کالموں اور فیچروں کی مقبولیت بڑھی۔ بعض اخبارات ہفتہ میں ایک یا دو دن خطوط کی اشاعت میں ناغہ کرنے لگے۔ بعض نے خطوط کی تعداد کم کر دی۔ لیکن ان خطوط کی ضرورت کم نہیں ہوئی۔ ہر انگریزی اور اردو اخبار خطوط بنام مدیر شائع کرتا ہے۔ ایک اردو اخبار میں اوسطاً ہر ماہ ڈیڑھ سو اور سال میں اوسطاً ڈیڑھ ہزار اور انگریزی اخبار میں اڑھائی ہزار سے زائد خطوط شائع ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی اخبارات میں خطوط کی ادارت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والے خطوط مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔

''خطوط بنام مدیر'' کے کالموں میں چھپنے والے خطوط اور ان کے مندرجات کی مختلف صورتیں یہ ہیں۔ یعنی ان خطوط میں:

۱۔ اخبارات کے مندرجات، خبروں، اداریوں، فیچروں، مضمونوں، تصویروں اور کارٹونوں کی تعریف کی جاتی ہے یا ان پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔

۲۔ اخبار کی پالیسی پر رائے زنی کی جاتی ہے۔

۳۔ عام ملکی یا غیر ملکی، تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تعلیمی، انتظامی اور اخلاقی معاملات و مسائل پر بحث کی جاتی ہے، خواہ وہ اس وقت متعلقہ اخبار میں زیر بحث ہوں یا نہ ہوں۔

۴۔ انفرادی، گروہی یا اجتماعی شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

۵۔ نئے نظریات، تصورات اور معاملات سامنے لائے جاتے ہیں۔

مندرجات کے حوالے سے قارئین کے خطوط کو انفرادی دلچسپی، مقامی یا محدود دلچسپی وسیع یا اجتماعی دلچسپی اور فکر انگیز خطوط میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے اُردو اخبارات میں شائع ہونے والے خطوط میں انفرادی نوعیت کے ایسے خطوط کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے جو عام قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہمارے ہاں خطوط بنام مدیر کے کالموں میں اس قسم کے عنوان اکثر نظر آتے ہیں۔ ''آئی جی متوجہ ہوں''، ''ارباب واپڈا سے اپیل''، ''منی آرڈر کی گمشدگی''، ''تنخواہ نہیں ملی''، ''نتیجے کا اعلان کیا جائے''، ''ریلوے حکام توجہ فرمائیں''، ''صدرِ مملکت کی خدمت میں''، ''محکمہ نہر سے ایک گزارش''، ''میرا شناختی کارڈ کب ملے گا؟''، ''میرا وظیفہ کدھر گیا'' وغیرہ وغیرہ۔

مراسلے کی شکل میں کچھ لکھنے کی ذمہ داری اخبار پر عائد نہیں ہوتی بلکہ وہ انفرادی رائے یا نظریہ تصور ہوتا ہے۔ رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ بہر حال جب ایک مراسلے کی صورت میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے تو اس کو جواب جوابی مراسلے میں دیا جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس نئی بات یا نظریے پر بحث شروع ہو جاتی ہے اور عام قارئین بھی بحث کی حد تک اسے ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ ابلاغ عامہ کی اصطلاح میں اس عمل کو تقطیری اثر کہا جاتا ہے۔ فرسودہ روایات کو ختم کرنا پتھر کو توڑنے کے برابر ہوتا ہے، اس لیے کامیاب اور موثر ابلاغ کا طریقہ یہ ہے کہ نئے خیالات و نظریات کو دھارے کی صورت میں یک دم منظر عام پر لانے کے بجائے قطرہ قطرہ ٹپکایا جائے۔ جس طرح پانی کے قطرے مسلسل گرتے رہنے سے پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے، اسی طرح نئے افکار بھی آہستہ آہستہ پرانے خیالات کے پتھر کو توڑ ڈالتے ہیں۔

مراسلات کے کالموں کی افادیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ بعض اُردو اخبارات میں تو بہت زیادہ اور کئی صورتوں میں مراسلات چھپنے لگے ہیں۔ مثلاً ایک تو ادارتی صفحے پر یا کسی دوسرے صفحے پر قارئین کے خطوط شائع ہوتے ہیں، دوسرے قارئین کے ہر طبقے کے مخصوص صفحات پر بھی قارئین کے خطوط، خطوط ہی کی صورت میں یا سوال و جواب کی شکل میں چھپتے ہیں۔ مثلاً طلبہ کے صفحے پر طلبہ کے خطوط اور خواتین کے صفحے پر خواتین کے خطوط بھی چھپتے ہیں۔ مراسلات کے اتنے کالموں کا شروع ہونا ان کی افادیت اور مقبولیت کی دلیل ہے۔ خطوط کی اشاعت سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اخبار کا ایڈیٹر قارئین کے احساسات و جذبات سے باخبر رہتا ہے۔ اس طرح اسے اخبار کی پالیسی کو زیادہ حقیقت پسندانہ بنانے اور بہتر اور موزوں بنانے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔

۲۔ خطوط سے خود اخبار اور مدیر کا محاسبہ ہوتا رہتا ہے اور قارئین کی تنقید اسے راہِ راست پر رکھتی ہے۔

۳۔ مراسلات سے جمہوریت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس سے عام لوگ حدود کے اندر رہ کر اپنی رائے کے اظہار کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔

۴۔ قارئین کو مکتوبات سے رہنمائی ملتی ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۵۔ شکایات کا موجب بننے والے افسروں اور محکموں کی اصلاح ہوتی ہے۔
۶۔ مراسلے حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔ ان سے حکومتوں کو عوام کے مسائل سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔
۷۔ خطوط ان لوگوں کے لیے نفسیاتی سہارے کا کام دیتے ہیں جن کے پاس اپنی شکایات اور جذبات کے اظہار کا اور کوئی وسیلہ نہیں ہوتا۔

اپنے نام خطوط کو اشاعت کے لیے منتخب کرتے ہوئے مدیر عام طور پر ان باتوں کا دھیان رکھتے ہیں کہ خط:

۱۔ قومی مفاد کے خلاف تو نہیں۔
۲۔ ذاتی اغراض کے لیے تو نہیں لکھا گیا۔
۳۔ کسی گروہ یا طبقے کے جذبات کو مجروح تو نہیں کرتا۔
۴۔ مشکوک مقاصد کے لیے تو تحریر نہیں کیا گیا۔
۵۔ اندازِ بیان ناشائستہ تو نہیں۔

اس لیے مدیر کے نام خط لکھتے ہوئے قاری کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ خط اخبار میں شائع نہیں ہوگا جس کا اختیار بہر حال اخبار/مجلّے کے مدیر کے پاس ہوتا ہے۔

(فنِ ادارت)

ڈاکٹر مسکین علی حجازی (۱۹۳۷۔۲۰۱۴ء)

ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے پنجاب یونیورسٹی سے صحافت اور تاریخ میں ایم اے کے بعد صحافت میں پی ایچ ڈی کیا۔ دورانِ تعلیم میں ہفت روزہ اور روزنامہ ''چٹان'' لاہور کے نائب مدیر کے طور پر کام کیا۔ روزنامہ ''آفاق'' اور روزنامہ ''کوہستان'' لاہور سے بھی بطور فیچر نگار وابستہ رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت سے منسلک ہوئے اور وہاں ۱۹۹۷ء کے بعد تک پڑھاتے رہے۔ اس دوران میں ۱۹۸۲ء میں بطور پروفیسر ترقی پائی اور بعد ازاں تادیر صدرِ شعبہ کی حیثیت سے تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ پنجاب یونیورسٹی سمیت بہت سی جامعات کے بورڈ آف سٹڈیز اور ہائر سٹڈیز کے رکن بھی تھے۔ انھوں نے صحافت کے مضمون کا مختلف سطحوں پر نصاب مرتب کرنے میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ **فنِ ادارت، اداریہ نویسی، خیابانِ صحافت** اور **صحافتی زبان** ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ کراچی میں وفات پائی۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ زیادہ تر اخبارات قارئین کے خطوط کن صفحات پر شائع کرتے ہیں۔
ب۔ ایک اردو اخبار میں ہر ماہ اوسطاً کتنے خطوط چھپتے ہیں؟
ج۔ اخبارات مراسلت کے کالم پر احتیاط کے طور پر کیا لکھا جاتا ہے؟
د۔ مراسلات سے کس رجحان کی نشوونما ہوتی ہے؟
ہ۔ مراسلوں میں کسی ایک موضوع پر بحث کو ابلاغِ عامہ کی اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟

۲۔ خطوط بنام مدیر سے کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں؟

۳۔ قارئین کو خط تحریر کرتے ہوئے کن امور کا خیال رکھنا چاہیے؟

۴۔ قارئین، مدیر کو کس کس نوعیت کے خط لکھتے ہیں؟

۵۔ مندرجہ ذیل عنوانات میں خطوط کی قسموں کی الگ الگ نشاندہی کیجیے:

الف۔ منی آرڈر کی رقم نہیں ملی
ب۔ ملتان۔ تلنبہ روڈ کو پختہ کیا جائے
ج۔ مضرِ صحت مشروبات
د۔ کمپیوٹر دوست بھی، دشمن بھی

ا۔ الف۔ فیچر کے لغوی معنی ہیں کسی شعبے کی خصوصیت۔ صحافتی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مضمون ہے جس میں تحریری انداز میں تصویروں کے بغیر یا تصویروں کی مدد سے کسی خاص مضمون کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہو۔

ب۔ کالم کسی دستے کی مخصوص انداز میں صف بندی یا کسی تحریر کی پیمائش کی اکائی کو کہتے ہیں۔ اخبارات کا کالم عام طور پر دو انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی اخبار کے کل صفحے کے برابر ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ کسی اخبار، رسالے میں مستقل عنوان کسے تحت باقاعدگی سے چھپنے والی تحریر بھی کالم کہلاتی ہے۔

اس سبق میں ان دو صحافیانہ اصطلاحوں کے علاوہ کم از کم دو اصطلاحات تلاش کریں اور ان کی مختصراً تشریح کریں۔

اخبار کے مدیر کے نام ایک خط کا نمونہ درج ذیل ہے

سرکاری ہسپتالوں کی حالتِ زار

مکرمی! میں آپ کے اخبار کے توسط سے اعلیٰ حکام کی توجہ سرکاری ہسپتال کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ سرکاری ہسپتالوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ عوام چاہے کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں، وہ سرکاری ہسپتال سے زیادہ نجی ہسپتال میں جانا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سرکاری ہسپتالوں کی حالتِ زار، عملہ کی غفلت ولاپرواہی اور گندگی ہے کیونکہ کوئی بھی انسان اپنے عزیز کی جان سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا اس لیے بے شک پرائیویٹ ہسپتال والے ان کی برسوں کی جمع پونجی ایک جھٹکے سے خرچ کروادیں لیکن ترجیح نجی ہسپتال کو ہی دی جاتی ہے۔ جو لوگ نجی ہسپتال کا خرچ برداشت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں سرکاری ہسپتال کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مریض اگر غلطی سے ہسپتال کا رخ کرتا ہے تو وہ صرف اللہ پر بھروسہ کر کے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اور عملہ کی طرف سے مایوس ہوتا ہے کچھ سرکاری ہسپتالوں کی حالت تو اتنی خراب ہے کہ نام سنتے ہی دل بیمار ہو جاتا ہے۔

جنرل وارڈ، بلیوں کے مہمان خانے کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مریضوں سے زیادہ بلیوں کو وہاں پر سہولتیں ہیں۔ جنرل وارڈ میں ۱۵ سے ۲۰ بلیاں ہر وقت موجود ہوتی ہیں جو مریضوں سے زیادہ تیمار داروں کو تنگ کرتی ہیں اور عیادت کرنے والوں کو دروازے تک چھوڑنے جاتی ہیں۔ اعلیٰ حکام سے گزارش ہے کہ اس کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ عوام الناس کو بنیادی سہولتیں، صاف ستھرا اور مستعد عملہ فراہم کیا جائے۔

الف، ب، ج

چٹی ہٹیاں، راولپنڈی

سرگرمی

اس سبق میں مشقی سوالات اور اس خط کی روشنی میں محدود دلچسپی اور وسیع تر دلچسپی کے حامل دو موضوعات یا مسائل پر ایک ایک خط لکھیں۔

ہدایات برائے اُساتذہ

- طلبہ کو کوئی اخبار دکھا کر اداراتی صفحات کی پہچان کروائی جائے۔
- اداراتی صفحات میں مراسلات کے حصے کی نشاندہی کر کے مراسلات کی نوعیت واضح کریں۔
- موضوعات دے کر طلبہ کے مراسلے لکھنے کی مشق کروائیں۔
- طلبہ ہر خبر، اداریہ، فیچر، کالم اور اشتہاروں کے اندازِ بیان واضح کریں۔

13 ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطے کی دُنیا

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ابلاغ کے مفہوم اور مختلف قسم کے جدید ذرائع ابلاغ سے آگاہ ہو سکیں۔
- الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے امتیازات کو جان سکیں۔
- سماجی رابطوں کے جدید ذرائع ابلاغ کے مثبت اور منفی اثرات سے باخبر ہو سکیں۔

پڑھیں

انسان نے جب سے اس کرۂ ارضی پر قدم رکھا ہے اُس وقت سے معاشرتی اور سماجی زندگی میں باہمی رابطوں کی اہمیت وافادیت دوچند ہوتی چلی جارہی ہے۔انسان کو سماجی جان ور بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ اپنی زندگی بِتانے کے لیے اسے دیگر انسانی طبقوں اور شعبوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔اس کی بقا کا تمام تر دارومدار باہمی رشتہ مندی، سماجی رابطوں اور رسم وراہ ہی پر رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ انسانی رشتوں، ناطوں اور تعلقات کی مضبوطی اور استحکام باہمی رابطوں کی استواری ہی پر منحصر تھا۔انسان اور انسانی معاشرے نے جُوں جُوں ارتقا کی منزلیں طے کیں ان کی سماجی زندگی بھی کئی انقلابات سے روشناس ہوتی چلی گئی۔رفتہ رفتہ سائنسی بنیادوں پر ہونے والی دریافتوں اور ایجادات نے انسانی زندگی کی گاڑی کو تیز رفتار پہیے لگادیے اور اس تیزیِ رفتار کی گرد میں گزرا وقت ایک گماں اور اس کے حالات وواقعات ایک قصہ کہانی کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے۔جدید تر سائنسی ایجادات اور دریافتوں کی بدولت ہی انسانی معاشرہ ایسی آسائشات اور سہولیات سے روشناس ہوا کہ ماضی کا انسان اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر تھا۔رہائش، لباس، کھانا پینا، ذرائع آمد ورفت اور ذرائع ابلاغ کے حوالے سے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرکے واقعی انسان نے اپنی منزل ستاروں سے آگے کی متعین کرلی ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک انسان اپنی تمام حاجات کی تکمیل تنِ تنہا کرنے کے قابل تھا اور نہ ہی کبھی ہو پائے گا۔کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ہر انسان دوسرے افرادِ معاشرہ کا کسی نہ کسی صورت میں محتاج ہے۔انسانی معاشرے میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اداروں، مختلف طبقوں اور پیشوں سے وابستہ افراد کے حوالے سے معلومات کسی ایک شخص کا اپنے پاس محفوظ کرلینا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مختلف نوعیت کی معلومات کو متعلقہ افراد تک پہنچانے کا نام ابلاغ ہے۔فی زمانہ دنیا کی آبادی کم وبیش سات ارب ہے۔اتنی بڑی اور وسیع دنیا میں مختلف واقعات اور حادثات رونما ہو رہے ہوتے ہیں، کئی طرح کی تعلیمی، ثقافتی، سماجی، تجارتی تقاریب منعقد کی جارہی ہوتی ہیں، مختلف کھیل کے میدانوں سے اپنی پسند کے کھلاڑیوں کا جوش وجذبہ بڑھانے کے لیے شور شرابے کی صدائیں بلند ہو رہی ہوتی ہیں۔دنیا کے ایک کونے میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو آناً فاناً دنیا کے دوسرے حصے میں اس کی اطلاع پہنچانا مقصود ہو جاتا ہے۔اطلاعات کی اس سُرعت انگیز ترسیل اور سبک رفتار نظام کو ذرائع ابلاغ کا نام دیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر دورِ جدید کی حیرت انگیز ترین ایجادات میں سے ایک ہے۔اس محیر العقول ایجاد کے باعث انسانی زندگی کے بیشتر شعبوں میں خوش گوار اور حیران کن انقلابات رُونما ہوئے ہیں۔فاصلے سمٹنا شروع ہو گئے۔ماضی میں بظاہر جو خواب وخیال کی حد تک ناممکن دکھائی دیتا تھا آج کا انسان اس سے گھر بیٹھے محظوظ اور لطف اندوز ہو رہا ہے۔کمپیوٹر کی دریافت سے ترقی کے جس سفر کا آغاز ہوا اُس کے متعلق مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ نے تو برسوں قبل ہی یوں تصویر کشی کردی تھی:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے (مرزا غالبؔ)

اور بقولِ علامہ اقبالؔ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

ابلاغ کے دو ذرائع انسان نے اپنے ارتقا کے آغاز سے ہی استعمال کرنے شروع کر دیے تھے۔ انبیا، رسل اور پیغمبرانِ جلیل اپنی بات کو زبانی طور پر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی دُور دراز کے مقامات تک پہنچانے کا بندوبست فرماتے تھے۔ کائنات میں مسلسل ترقی کا سفر جاری و ساری ہے۔ دوسرے شعبوں کی مانند ذرائع ابلاغ کا فیلڈ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلی فون، ٹیلی گرام جیسی اپنے دَور کی حیرت انگیز ایجادات، اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ آج کا دَور انسانی تاریخ کا تیز رفتار اور ترقی یافتہ ترین دَور ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے لیس آج کا انسان محیر العقول صلاحیتوں کا مالک بن بیٹھا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کے دُور دراز علاقوں تک معلومات پہنچانے کا کام قدرے آسان بنا دیا۔ دنیا کی قوموں نے ایک قدم آگے بڑھ کر، اِن ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے ملی مفادات، تہذیبی و اخلاقی اقدار و روایات، قومی وقار اور دینی و مذہبی افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کا کام لینا بھی شروع کر دیا۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے باہمی رابطوں نے سوشل میڈیا کی شکل اختیار کر کے دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ معلومات اور پیغامات کا تُند و تیز سیلاب ایک کلک پر آپ کے سامنے آنمودار ہوتا ہے۔ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کے حوالے سے اظہار سوشل میڈیا کا مخصوص زاویہ ٹھہرا۔ دوستوں کاروباری رابطوں کو تلاش کر کے اپنی پسند کی ایک کمیونٹی کا بآسانی حصہ بنا جا سکتا ہے۔ سوشل میڈیا کی مختلف صورتیں ہیں۔ جن میں واٹس ایپ (Watsapp)، یوٹیوب (Youtube) فیس بک (Facebook)، ٹویٹر (Twitter)، لنکڈ اِن (LinkedIn)، بلاگ (Blog)، انسٹا گرام (Instagram)، کورا (Quora) وغیرہ زیادہ اہم اور معروف ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والی معلومات ایک لمحے میں اشتراک (Sharing) کے ذریعے دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھے شخص تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔ مثبت اخلاقی، سماجی سرگرمیوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے، دینی، مذہبی، تعلیمی، ثقافتی، اقدار و روایات کو پروان چڑھا کر ایک پُرامن بین الاقوامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دے کر ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ انسانی نسل آج جس آفاقی وبا (Pandemic) کورونا (Covid-19) کی ہلاکت خیزیوں کی لپیٹ میں ہے اس کے دوران بھی سوشل میڈیا نے اپنے مثبت اثرات کو اجاگر کرنے اور منوانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ماضی کے گزرے واقعات اور یادداشتوں کو محفوظ رکھنے میں بھی سوشل میڈیا نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے فرمایا تھا:

ہے دِل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

جس طرح ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں؛ مثبت اور منفی۔ اسی طرح سوشل میڈیا کا دوسرا رُخ بھی نہایت تاریک اور بھیانک ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں باہمی انسانی رابطوں کو سہل اور وسیع بنایا ہے وہیں محبت، اخلاص، رواداری، رکھ رکھاؤ پر منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث بھی بنا ہے۔ شومئ قسمت کہ ہم نے معلومات اور پیغامات کے اس سیلاب میں خود کو اُلجھانے ہی میں اپنی بقا تصور کر لی ہے۔ ہماری علمی، تعلیمی، دینی مذہبی، اخلاقی اقدار و روایات کا جنازہ نکلتا چلا جا رہا ہے۔ سات سمندر پار انسانوں کے ساتھ جُڑا رہنے والا انسان، ایک گھر کی چار دیواری میں بسنے والوں سے اجنبی بنا بیٹھا ہے۔ تفریح اور خود نمائی کی آڑ میں ہم بیزاریت کو

فروغ دینے کا باعث بنتے چلے جارہے ہیں۔ نوجوان نسل اپنا قیمتی وقت سوشل میڈیا پر ضائع کر رہی ہے جس سے اخلاقی، ذہنی، فکری اور عقلی انحطاط تو ظہور پذیر ہو ہی رہا ہے بلکہ غیر اخلاقی سرگرمیوں اور بے حیائی کو فروغ بھی حاصل ہو رہا ہے۔ سادہ لوح نوجوان نسل کو جھانسا دے کر تہذیب و شائستگی سے دُور کیا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا پر جعلی اکاؤنٹس بنا کر لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ اخلاقی، مذہبی، ملکی قومی مفادات کے دشمن اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے بھی سوشل میڈیا کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ انسانی نفسیاتی، مذہبی، اخلاقی، سماجی قدریں داؤ پر لگ گئی ہیں۔ اپنوں سے اپنائیت کا لطف چھنتا چلا جارہا ہے۔ رشتے ناطے، قُربت کی حلاوت سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ سوشل میڈیا کے مثبت استعمال کو فروغ دیا جائے۔ دینی، تعلیمی، اخلاقی اور سماجی اقدار و روایات کو پروان چڑھایا جائے تاکہ محبت، اخلاص، رواداری، امن و آشتی، برداشت، باہمی اتحاد و یگانگت سے مزین ایک خوب صورت انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے۔

مشق

۱۔ سوالات کے مختصر جوابات لکھیں؟

الف۔ ابلاغ کی تعریف لکھیں۔ ب۔ ذرائع ابلاغ کے نام لکھیں۔

ج۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں فرق واضح کریں۔ ح۔ سوشل میڈیا کے مثبت اثرات کیا ہے؟

د۔ سوشل میڈیا کے منفی اثرات کیا ہیں؟ ز۔ سوشل میڈیا کے منفی اثرات سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟

س۔ سوشل میڈیا نے دنیا کے مختلف خطوں کے انسانوں کو قریب لانے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟

و۔ دورِ جدید کی حیرت انگیز ایجاد کون سی ہے؟ ہ۔ سوشل میڈیا کی چند ایک صورتوں کے نام لکھیں؟

۲۔ درج الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں۔

ابلاغ سرعت آناً فاناً قصۂ پارینہ شومیِ قسمت

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیں۔

تعلقات انقلابات ذرائع افراد انبیا رُسل اقدار

سرگرمی

کلاس میں طلبہ کے مابین سوشل میڈیا کے منفی اور مثبت اثرات پر مذاکرہ کرایا جائے۔

ہدایات برائے اُساتذہ

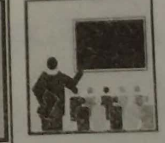

- تعلیمی اداروں میں طلبا کے موبائل فون کے استعمال پر گفتگو کریں۔
- جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے آن لائن کلاسز کی افادیت بیان کریں۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

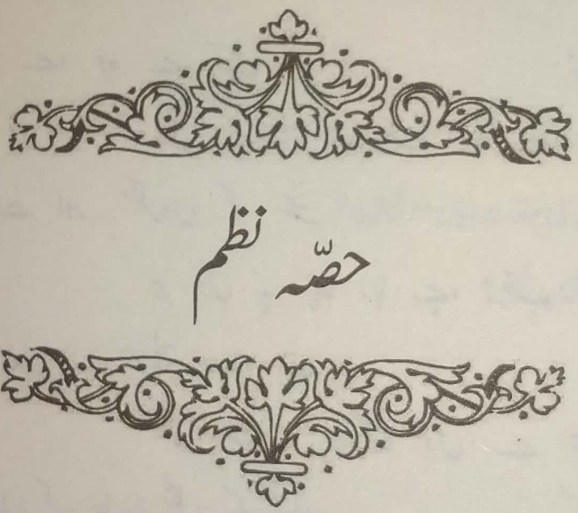

حصّہ نظم

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

1 ربِّ کائنات

اس نظم کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کسی نظم کا شعری اصطلاحوں کی روشنی میں جائزہ لے سکیں، تشریح کر سکیں۔
- حمد کی فن شعر کے لحاظ سے تحسین کر سکیں۔
- اُردو شاعری کی رفتار اور معیار کے ساتھ سماعت کر سکیں۔
- مصرع، شعر اور قافیے کی اصطلاحوں سے واقف ہو سکیں۔

پڑھیں

کامل ہے جو ازل سے، وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک، وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے، رُعبِ جلال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں، یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز، دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیوں کر، جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سُو، عالم میں جال تیرا

ان کی نظر میں شوکت، جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے، جن کے جلال تیرا

دل ہو کہ جان، تجھ سے، کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

بیگانگی میں حالیؔ، یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے سر دُھنیں گے، قال اہلِ حال تیرا

(کلّیاتِ نظمِ حالیؔ)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے مختصر حالاتِ زندگی حصۂ نثر میں بیان ہو چکے ہیں۔ نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی حالیؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اردو ادب کے چند بزرگ ترین معماروں اور محسنوں میں سے ہیں۔ ان کی شاعرانہ تخلیقات کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع اور جملہ اصنافِ سخن پر محیط ہے۔ انھوں نے غزل گوئی میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے جدید اردو شاعری، تنقید اور سوانح نگاری میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ نثر کے علاوہ مولانا حالی کی اہم تصانیف میں نظم حالی، دیوانِ حالی، مسدسِ حالی (مدوجزر اسلام) شامل ہیں۔ حالیؔ نے رباعیات و قطعات، قصائد اور نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی طویل نظم مسدسِ حالیؔ مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور علمی زندگی کا مرقع ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں قومی بیداری کا شعور پیدا کرنا تھا۔ حالیؔ کی دیگر نظموں میں شکوۂ ہند، مناجاتِ بیوہ اور چُپ کی داد خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

حالیؔ کی شاعری میں سادہ بیانی اور حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ انھوں نے عمدہ شاعری کی جو خصوصیت بیان کی ہے، اس میں سادگی، اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری ہے۔ حالیؔ کی زندگی میں مسدس کے علاوہ ان کے کلام کے دو مجموعے مجموعۂ نظمِ حالیؔ اور دیوانِ حالیؔ شائع ہوئے۔

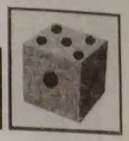

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ شاعر نے عارفوں کی حیرت اور منکروں کے سکتے کا کیا سبب بیان کیا ہے؟

ب۔ نظم ربِّ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کون سی صفات بیان ہوئی ہیں؟

ج۔ کن لوگوں کی نظر میں کسی کی شوکت نہیں جچتی؟

د۔ شاعر نے جان کو کس کا مال کہا ہے؟

ہ۔ شاعر نے کس چیز کو رنگِ آشنائی کہا ہے؟

و۔ حمد کی تعریف لکھیں؟

ء۔ اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۲۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیں اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کریں:

رعبِ جلال　　ہر سُو　　رنگِ آشنائی　　اہلِ حال

۳۔ مصرعے کے لغوی معنی ہیں دروازے کا ایک پٹ۔ شاعری کی اصطلاح میں شعر کی ہر سطر کو مصرع کہتے ہیں۔ جس طرح دروازے کے دونوں پٹ مل کر دروازہ مکمل کرتے ہیں، اس طرح دو ہم وزن مصرعوں سے مل کر شعر مکمل ہوتا ہے۔ شاملِ نصاب نظم "ربِّ کائنات" میں کُل چودہ مصرعے ہیں جب کہ اشعار کی تعداد سات ہے۔

۴۔ مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں:

الف۔ الطاف حسین حالی کے مطابق کون سا بندہ حمد سرا ہے؟

الف۔ گنہگار　　ب۔ نافرمان　　ج۔ نیکوکار

ب۔ حالی کے مطابق کون حیرت میں مبتلا ہے؟

الف۔ زاہد　　ب۔ عابد　　ج۔ عارف

ج۔ اللہ کی ذات کے حوالے سے سکتے کا شکار کون ہے؟

الف۔ منکر　　ب، کافر　　ج۔ مشرک

د۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کمال کب سے کامل ہے؟

الف۔ برسوں سے　　ب۔ صدیوں سے　　ج۔ ازل سے

ر۔ حالی کی شاعری یا کلام سُن کر کون سر دُھنے گا؟

الف۔ اہلِ حال　　ب۔ اہلِ قال　　ج۔ اہلِ دنیا

س۔ مولانا الطاف حسین حالی کی طویل نظم مسدسِ حالی کا اصل نام کیا ہے؟

الف۔ طلوعِ اسلام　　ب۔ مدوجزرِ اسلام　　ج۔ شاہنامہ اسلام

۴۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح لکھیں۔

الف)　ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے، رُعبِ جلال تیرا

ب)　ان کی نظر میں شوکت، جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے، جن کے جلال تیرا

ج)　دل ہو کہ جان، تجھ سے، کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

سرگرمی

قافیہ باہم ہم آواز الفاظ کو کہا جاتا ہے جیسے اثر، کسر، سفر وغیرہ۔ شاعری میں قافیے کا استعمال شاعری کو مترنّم بنانے کے لیے ہے۔ نظم "ربِّ کائنات" کے قوافی تحریر کریں۔

ہدایات برائے اُساتذہ

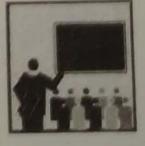

- صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ نظم خوانی کی جائے۔
- اللہ تعالیٰ کی لامحدود صفات کے بارے میں ذہن نشین کرایا جائے۔
- نظم کے ایک ایک شعر کے مطالب آسان اور سادہ لفظوں میں بتائے جائیں۔
- نظم کا مرکزی خیال اور خلاصہ لکھنے کا طریقہ بتایا جائے۔

2

نعت

اس نعت کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- شعر اور شاعری کے بنیادی لوازمات سے آگاہ ہو سکیں۔
- نعت گوئی کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آشنا ہو سکیں۔
- کسی شعر کا مرکزی خیال سمجھ کر پڑھنے کی صلاحیت حاصل کر سکیں۔
- شاعری کے حسنِ بیان سے لطف اندوز ہو سکیں۔

پڑھیں

دلِ دردمند کی داستاں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں
تمھی غم زدوں کے ہو قدرداں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

تمھی بے کسوں کے شفیق ہو، تمھی بے بسوں کے رفیق ہو
جو گزرتی دل پہ ہے جانِ جاں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

مرے حال پر بھی کرم کرو، جو کروں میں عرض وہ سُن تو لو
تمھی باپ ماں سے ہو مہرباں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

تمھی داد گر ہو یتیم کے، تمھی چارہ گر ہو سقیم کے
ہمہ تن ہوں درد میں ناتواں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

مجھے دربدر یہ پھرائے گا، نہ کبھی یہ راہ پر آئے گا
مجھے پیس ڈالے گا آسماں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

نہ زمیں سُنے نہ فلک سُنے، نہ بشر سُنے، نہ ملک سُنے
نہیں سُنتا کوئی مری فغاں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

جو امیرؔ دیکھیں نبیؐ اِدھر، تو کہوں یہ ہاتھوں کو جوڑ کر
کہ تڑپ کو دل کی میں نیم جاں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

(صنم خانۂ عشق)

امیر مینائی (۱۸۲۹ء۔ ۱۹۰۰ء)

امیر احمد مینائی نام۔ تخلص امیر، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام کرم احمد مینائی لکھنوی تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم فرنگی محل، لکھنؤ میں حاصل کی۔ ۱۸۵۳ء میں واجد علی شاہ سلطانِ اودھ کی ملازمت اختیار کی اور دو کتابیں **ارشاد السلطان** اور **ہدایت السلطان** تصنیف کر کے پیش کیں۔ تین سال بعد سلطنتِ اودھ ضبط ہو جانے سے بے روزگار ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء میں رامپور کی عدالتِ دیوانی کے مفتی مقرر ہوئے۔

فنِ شعر میں مظفر علی خان اسیر کے شاگرد تھے۔ موزونیِ طبع اور علمی استعداد کی بدولت شعر گوئی میں کمال حاصل کر لیا۔ رامپور کی شاعرانہ صحبتوں میں اِس فن کو مزید جِلا ملی۔ شاعری میں اعلیٰ استعداد رکھنے کے باعث نواب کلب علی خان والیِ رامپور نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا۔

امیر کی تصانیف میں غزلوں کے دو دیوان **مرآۃ الغیب** اور **صنم خانۂ عشق** مشہور ہیں۔ **محامدِ خاتم النبیین** (صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم) کے نام سے پورا دیوان نعتیہ ہے جس سے اُن کا جوشِ عقیدت نمایاں ہوتا ہے۔ امیر کے کلام میں رنگینی اور مرصّع کاری نظر آتی ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ پہلے شعر میں شاعر حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمت میں کیا کہنا چاہتا ہے؟

ب۔ نعت کے پانچویں شعر میں "مجھے پیس ڈالے گا آسماں" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ج۔ شاعر کو زمیں، فلک، بشر اور مُلک سے کس بات کا شکوہ ہے؟

د۔ نعت کے آخری شعر میں شاعر نے کیا آرزو کی ہے؟

و۔ اس نعت میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

ہ۔ نعت کی تعریف کریں؟

ء۔ اِس نعت کا مرکزی خیال لکھیں؟

ی۔ شاعر کے خیال میں یتیم اور سقیم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذاتِ بابرکات کیا اہمیت رکھتی ہے؟

۲۔ ردیف کی تعریف بیان کریں، اس نعت میں کون سے الفاظ بطورِ ردیف استعمال ہوئے ہیں؟

۳۔ اس نعت کے حوالے سے شاعر کے احساسات اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۴۔ مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں:

الف۔ شاعر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذات کو کن کے لیے شفیق قرار دیا ہے؟

الف۔ بیواؤں کے لیے ب۔ یتیموں کے لیے ج۔ بے کسوں کے لیے

ب۔ شاعر کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذاتِ مبارک بے کسوں کی ہے:

الف۔ رحمت ب۔ رفیق ج۔ نعمت

ج۔ امیر مینائی کے مطابق سقیم کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذات ہے:

الف۔ دردمند ب۔ داد گر ج۔ چارہ گر

د۔ شاعر کت مطابق حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کس کے داد گر ہیں؟

الف۔ یتیم کے ب۔ مسکین کے ج۔ غریب کے

2۔ نعت

ر۔ شاملِ نصاب نعت کس شعر مجموعے سے لی گئی ہے؟

الف۔ محامدِ خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم) ب۔ صنم خانۂ عشق ج۔ مرآۃ الغیب

سرگرمی

ا۔ ش عر کا لفظ شعور سے نکلا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں لفظ اور خیال کے امتزاج کو حسنِ ترتیب سے بیان کرنے کا نام شعر ہے۔ اس کے لیے وزن بہت ضروری ہے۔ خیال کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو، اگر اس میں وزن نہیں ہے تو وہ شعر نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شعر کے لیے وزن کی قید ضروری نہیں، لیکن وزن کے بغیر شعر کی تاثیر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ شعر کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ جس طرح تال کے بغیر موسیقی کا لطف نہیں رہتا اسی طرح وزن کے بغیر شعر بے تاثیر ہو جاتا ہے۔ اس نعت کا ہر شعر باوزن اور لفظ و خیال ہم آہنگ ہیں۔ آپ اس نعت میں سے اپنی پسند کا شعر چُن کر کاپی میں لکھیں اور پسندیدگی کی وجہ بیان کریں۔

۲۔ امیر مینائی کی یہ نعت غزل کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ دوسری شعری ہئیتوں میں بھی نعت لکھی جاتی ہے: جیسے مثنوی، رباعی، مسدس، مخمس، قطعہ وغیرہ۔ ذیل میں دو نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ آپ ان کی ہئیت کا تعین کریں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

(الطاف حسین حالی)

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

(ماہر القادری)

ہدایات برائے اُساتذہ

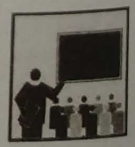

- نظم خوانی کسی خوش الحان طالبِ علم سے کرائی جائے۔
- نعت لکھتے ہوئے جس سلیقے اور قرینے کی ضرورت ہے، اس کے بارے میں بتایا جائے۔

3 برسات کی بہاریں

اس نظم کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کسی نظم کو اس کے فنی محاسن، اجزاء اور ہیئت کے لحاظ سے پڑھنے کا سلیقہ حاصل کر سکیں۔
- کسی نظم کے بند اور بند کی ہیئت کے حوالے سے مسدس، مخمس اور مثمن وغیرہ کو پہچان سکیں۔
- مخمس نظم کو نثر کی صورت میں ترتیب اور روانی کے ساتھ تحریر کر سکیں۔

پڑھیں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا ، برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر، ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا ، جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں ، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے، کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے ، بادل گرج رہے ہیں
اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہیں یارب! سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا، ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں، پہچان تیری قدرت
تیتر پکارتے ہیں، سبحان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں، قمری پکارے کُو کُو
پی پی کرے پپیہا، بگلے پکاریں تُو تُو
کیا ہُدہُدوں کی حق حق، کیا فاختوں کی ہُو ہُو
سب رَٹ رہے ہیں تجھ کو، کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے، لو! یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری، کوٹھا ندان ٹپکا
باقی تھا اِک اُسارا، سو وہ بھی آن ٹپکا

کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے، جس جا زمیں پھسلنی
مشکل ہوئی ہے واں سے، ہر اِک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں، پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی
جوتی گڑی تو واں سے، کیا تاب پھر نکلنی

کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

(کُلیّاتِ نظیر آکبر آبادی)

نظیر آکبر آبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء)

ولی محمد نام، نظیرؔ تخلص، دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ نظیرؔ ہندی اور فارسی کے علاوہ کسی قدر عربی بھی جانتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق خوش نویسی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ طبیعت میں قناعت پسندی تھی، اس لیے دولت اور مقام و منصب کے حصول کی کوشش نہ کی۔ ابتدا میں متھرا کا سفر کیا اور کسی مکتب میں معلّم ہو گئے، مگر پھر آگرہ چلے آئے۔

نظیرؔ کی شاعری کی زبان سادہ اور موضوعات عام ہیں۔ اسی لیے انھیں عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں موسموں، تہواروں، مناظرِ فطرت، رسومات اور معاشرتی زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ نظیر آکبر آبادی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات، ان کا پیرایۂ اظہار اور زبان اس دیس کی مٹّی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں ایک عرصے تک باقاعدہ سنجیدہ شاعر کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا مگر بعد میں اہلِ فن نے توجہ کی اور انھیں اردو کے اہم اور بڑے شاعروں کی صف میں جگہ دی گئی۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ شاعر نے برسات کے کون کون سے منظر بیان کیے ہیں؟

ب۔ نظم کے چوتھے بند میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی کن قدرتوں کا ذکر کیا ہے؟

ج۔ نظم میں کن کن پرندوں کے نام آئے ہیں؟

د۔ برسات کے موسم میں مکانوں اور گھروں کی کیا صورت ہوتی ہے؟

ہ۔ نظم کے آخری بند میں شاعر نے کس منظر کو پیش کیا ہے؟

و۔ ٹیپ کا مصرع کسے کہتے ہیں؟

ء۔ ترکیب بند اور ترجیع بند میں کیا فرق ہے؟

ی۔ مخمس کس نظم کو کہتے ہیں؟

۲۔ نظم "برسات کی بہاریں" کا مرکزی خیال لکھیں۔

۳۔ مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں:

۱۔ نظم کے پانچویں بند میں کس کا ذکر ہے:

الف۔ پرندے　　ب۔ جانور　　ج۔ برسات　　د۔ مناظر

۲۔ نظیر اکبر آبادی کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

الف۔ شاعری　　ب۔ معلمی　　ج۔ سیاحت　　د۔ سیاست

۳۔ کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں　قواعد کی رُو سے اس مصرعے کو کیا کہیں گے؟

الف۔ ٹاپ کا مصرع　　ب۔ ٹیپ کا مصرع　　ج۔ حاصل غزل مصرع

۴۔ نظم برسات کی بہاریں　ہیئت کے اعتبار سے کیا ہے؟

الف۔ مخمس ترکیب بند　　ب۔ مخمس ترجیع بند　　ج۔ مسدس ترکیب بند

۵۔ ایسی نظم جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں، کو کیا کہتے ہیں؟

الف۔ مخمس　　ب۔ مسدس　　ج۔ قطع بند

۶۔ اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کو کیا کہا جاتا ہے؟

الف۔ اسلامی شاعر　　ب۔ رومانوی شاعر　　ج۔ عوامی شاعر

۷۔ ولی محمد کس شاعر کا اصل نام ہے؟

الف۔ حالیؔ　　ب۔ بے نظیر شاہ　　ج۔ نظیر اکبر آبادی

۸۔ موسموں، تہواروں، مناظرِ فطرت، رسوپات جیسے عوامی موضوعات کس شاعر کی شاعری کا اہم حصہ ہیں؟

الف۔ مرزا غالبؔ　　ب۔ میر تقی میرؔ　　ج۔ نظیر اکبر آبادی

سرگرمی

ذرا اس نظم کو پڑھ کر تقابلی مطالعہ کر کے بتائیں کہ کس شاعر نے برسات کی منظر نگاری بہت عمدہ کی ہے؟ کیوں؟

جو سُوکھی زمیں پہ ترشّح ہُوا — نکلتی ہے بُو سوندھی سوندھی سی کیا
گرجتے ہیں بادل ، چمکتی ہے بَرق — ہُوا صحن کا صحن پانی میں غرق
گئی نیند اُچَٹ پانی کے شور سے — بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے
ہوا زور سے چلتی ہے بار بار — پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوار
بنا ہے جو وہ ٹین کا سائباں — ہے اس وقت آرگن کا اس پر گماں
صبا کے طمانچے جو کھائے ہیں آج — تو پودے سروں کو جھکائے ہیں آج
چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار — ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار
دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر — فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر
اُٹھی شاخِ گل سبزے کو چوم کر — برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر
ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ — ہُوا غسل سے ہر شجر کو فراغ
یکایک رُکی بوند ، ٹھہری ہَوا — نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا
تروتازہ ہر نخل ہے شاد کام — لبالب ہیں پانی سے تھالے تمام

کہیں کوئی چلّا رہا ہے کہ ہاں
ذرا دیکھنا اس گھڑی کا سماں

(بے نظیر شاہ)

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

ہدایات برائے اُساتذہ

- نظم خوانی سے قبل شاعر کا تعارف اور اس کی نظم نگاری کا پس منظر بیان کیا جائے۔
- نظم کی تشریح کے دوران الفاظ کے معانی بیان کرنے کے ساتھ ان کے صوتی آہنگ کا ذکر کیا جائے۔
- لفظوں کے ذریعے تصویریں بنانے اور ایک پورا منظر دکھانے کا عمل واضح کیا جائے۔
- نظم کا مجموعی تاثّر قلم بند کرنے کا طریقہ سمجھایا جائے۔

4

دُعا

(مسجدِ قُرطبہ میں لکھی گئی)

اس نظم کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کسی فن پارے کا مرکزی خیال اور تصورات کے اندازِ بیان کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔
- علم بیان کے اسرار و رموز خاص طور پر رمز اور کنایہ کی اصطلاحوں کی روشنی میں اپنے ذوقِ شعری کو جلا دے سکیں۔
- فکری، علمی اور فنی لحاظ سے کسی نظم کی تشریح و توضیح کر سکیں۔

پڑھیں

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نَواؤں میں ہے، میرے جگر کا لہو

صحبتِ اہلِ صفا، نُور و حُضور و سُرور
سرخوش و پُرسوز ہے، لالہ لبِ آبجُو

راہِ محبّت میں ہے، کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی، ایک مری آرزو

میرا نشیمن نہیں، درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تُو، شاخِ نشیمن بھی تُو

تجھ سے گریباں مرا، مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہُو

تجھ سے مری زندگی، سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی مری آرزو ، تُو ہی مری جستجو

پاس اگر تُو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تُو ہے تو آباد ہیں، اُجڑے ہوئے کاخ و کُو

پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اُسے، توڑ کے جام و سبو

چشمِ کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبُو، خلوتیوں کے کدُو

تیری خدائی سے ہے، میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لا مکاں، میرے لیے چار سُو

فلسفہ و شعر کی، اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنّا، جسے کہ نہ سکیں رُو برو

(بالِ جبریل)

علامہ محمد اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

محمد اقبال نام اور تخلص اقبالؔ تھا۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا، ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں خوش قسمتی سے انھیں مولوی سید میر حسن ایسے شفیق اُستاد مل گئے، جن سے انھوں نے بہت فیض حاصل کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبالؔ نے فلسفے کے مضمون میں ایم۔اے کیا۔ یہاں انھیں پروفیسر ٹامس آرنلڈ جیسے استاد اور رہنما کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بھرپور موقع میسّر آیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں کچھ عرصہ انھوں نے بطور استاد فرائض انجام دیے مگر علم کی لگن انھیں یورپ لے گئی۔ قیامِ یورپ کے دوران انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بار ایٹ لاء کی ڈگری حاصل کی۔ علاوہ ازیں میونخ یونیورسٹی، جرمنی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس آگئے اور اپنی شاعری کے ذریعے ملک و قوم کی اصلاح اور بیداری میں مصروف ہو گئے۔

علامہ اقبالؔ نے اُردو اور فارسی میں پُراثر اور ولولہ انگیز شاعری کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ملّتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور اپنے اثر انگیز کلام سے عالمِ اسلام کو گراں خوابی سے بیدار کیا۔

اقبالؔ کی اردو شاعری کی کتابوں میں **بانگِ درا**، **بالِ جبریل** اور **ضربِ کلیم** شامل ہیں۔ **ارمغانِ حجاز** میں بھی کچھ نظمیں اُردو میں ہیں جب کہ اس کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے۔ یہ سب مجموعے **کلیاتِ اقبال** کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

الف۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس نظم میں کس آرزو کا اظہار کیا ہے؟

ب۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم 'دُعا' کے دوسرے شعر میں کس طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

ج۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم ''دُعا'' کا مرکزی خیال لکھیں؟

د۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی نظم ''دُعا'' میں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

ہ۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اس نظم کا پس منظر کیا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں:

صُحبت　　آبجو　　نشیمن　　صُبحِ نشور　　جُستجو　　کاخ و کُو　　جام و سبو　　ساقیا

لامکاں　　حرفِ تمنا

۳۔ نظم اور غزل میں کیا فرق ہے؟

۴۔ نظم خیال کے تسلسل کی وجہ سے اُردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ غزل کے برعکس نظم کے اشعار موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ اِسے غزل سمیت کسی بھی ہیئت میں لکھا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ نظم غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ جو اس کے قافیوں سے ظاہر ہے۔ تاہم اس پر دیے گئے عنوان نے اسے غزل سے الگ کر دیا ہے۔ اِس کے پہلے شعر میں "وضو" اور "لہو" کے قافیے آئے ہیں۔

(i)۔ کنایہ: کنایہ کے معنی مخفی اشارے یا پوشیدہ بات کے ہیں۔ الفاظ کا ایسا استعمال جس میں الفاظ لُغوی معنی سے الگ کوئی معنی دیتے ہیں اور اس سے لُغوی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہوں اسے کنایہ کہتے ہیں۔ کنائے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

؎ صحبتِ اہلِ صفا، نُور و حُضور و سُرور
سرخوش و پُرسوز ہے، لالہ لبِ آبجُو

یہاں اہلِ صفا کی محبت اور آبجُو اور لالے کی قربت کا کنایہ استعمال ہوا ہے۔

(ii)۔ کنایہ بُعید: جب ایک شخص یا چیز سے بہت سی صفتیں منسوب کی جائیں اور ان تمام صفتوں سے موصوف بھی مراد ہو۔ مندرجہ بالا شعر میں نور، حضور اور سرور کی خاصیتیں اہلِ صفا کی محبت کی دَین قرار دی گئی ہیں۔ جس طرح لالے میں بہتی ہوئی ندی کی قربت میں سرگوشی اور پرسوزی کی صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(iii)۔ تصریح: کنائے کی وہ قسم جس میں موصوف مذکور نہ ہو جیسے:

؎ پھر وہ شرابِ کُہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اُسے، توڑ کے جام و سبُو

یہاں شرابِ کہن صفت کے طور پر آیا ہے لیکن موصوف مذکور نہیں ہے۔

(iv)۔ رمز: اگر کنائے میں واسطے بہت نہ ہوں لیکن پوشیدگی تھوڑی سی ہو تو اسے رمز کہتے ہیں جیسے:

سیاہی مونھ کی گئی، دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامہ کُہنہ سے مے کی بُو نہ گئی

سرگرمی

اس نظم اور دیگر غزلوں اور نظموں میں سے کنائے کی مثالیں کنائے کی نوعیت کی وضاحت کے ساتھ اپنے اُستاد کی مدد سے تلاش کریں۔

ہدایات برائے اُساتذہ

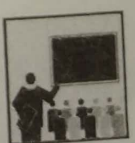

- نظم خوانی سے قبل اقبال کی نظم "دُعا" کا تعارف اور پس منظر بیان کیا جائے۔
- اقبال کی شاعری کی مخصوص علامتوں مثلاً: لالہ، نشیمن، شرابِ کہن، ساقیا وغیرہ کی وضاحت آسان پیرائے میں کی جائے اور ان کی روشنی میں نظم کا مجموعی تاثّر بیان کیا جائے۔
- اقبال کے اور بھی اشعار یاد کرائے جائیں۔

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

حصّہ غزل

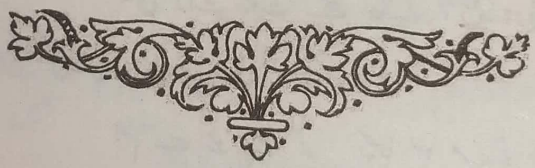

FBISESOLVEDPASTPAPERS.COM

1 اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اس غزل کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- غزل کے عمومی مزاج کے علاوہ مصرع، شعر، قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع ایسی اصطلاحوں سے آشنا ہو سکیں۔
- علم بیان کی بنیادی اصطلاحوں سے مزید آگاہی حاصل کر سکیں۔
- اشعار میں شامل الفاظ کے مجازی اور کنایاتی معنی تک رسائی پا سکیں۔
- اشعار سن کر مصرعوں اور شعروں کے تلفظ، لحن اور ادائیگی سے شعوری طور پر لطف اندوز ہو سکیں۔

پڑھیں

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کِیا
دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کِیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں مونْد
یعنی رات بہت تھے جاگے ، صبح ہوئی آرام کِیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اُس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کِیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ، ہم کو عبث بدنام کِیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اِتنا ہے
رات کو رو رو صبح کِیا ، یا دِن کو جُوں توں شام کِیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کِیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کِیا

(کلیاتِ میر تقی میرؔ)

۱۔ اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

میر تقی میرؔ (۱۷۲۵ء۔۱۸۱۰ء)

میر محمد تقی نام، میر تخلص۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی متقی تھا جو ایک درویش تھے۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم سید امان اللہ سے حاصل کی۔ سید امان اللہ کی رحلت کے بعد ان کی تربیت والد نے کی مگر وہ بھی جلد ہی چل بسے تو میرؔ کی پریشانیوں کے دور کا آغاز ہوا۔ تلاشِ معاش کی فکر دہلی لے گئی۔ پہلے ایک نواب کے ہاں ملازم ہوئے پھر اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں سراج الدین آرزوؔ کے پاس رہے مگر ان کی بد سلوکی کے باعث یہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے جب دہلی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، تو ناچار لکھنؤ چلے گئے اور نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے، مگر جی نہیں لگا تو واپس دہلی چلے آئے اور باقی عمر اسی شہر میں گزاری۔ میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی شناخت غزل اور غزل کی شناخت ان سے ہے۔ انھوں نے غزل میں سادہ بیانی کو شعار بنایا اور اس میں وہ سوز و گداز اور تاثیر پیدا کی کہ بڑے بڑے اساتذہ نے انھیں اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ ان کی زبان شستہ، سادہ اور پاکیزہ ہے۔ ان کے یہاں عاشقانہ مضامین اور غم والم کی بہتات ہے۔ تصوّف کے مضامین بھی موجود ہیں اور اپنے عہد کے معاشرتی حالات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ غزلوں کے چھے دیوان اور کئی مثنویاں اُن کی یادگار ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ **کلیاتِ میر** کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ غزل میں مطلع سے کیا مراد ہے؟

ب۔ میر تقی میرؔ کی اِس غزل میں مطلع کی نشان دہی کریں۔

ج۔ میر تقی میرؔ نے بیماریِ دل کے بارے میں کیا بتایا ہے؟

د۔ میر تقی میرؔ نے عہدِ جوانی کس طرح کاٹا؟

ر۔ میر تقی میرؔ نے اِس غزل میں خود کو مجبور کیوں کہا ہے؟

و۔ میر تقی میرؔ کو یہاں کے سپید و سیہ میں کس قدر دخل ہے؟

ہ۔ غزل کے مقطع میں میر تقی میرؔ نے اپنے مذہب کے متعلق کیا بتایا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں:

عہدِ جوانی　تہمت　عبث　سپید و سیہ　جوں توں　ساعد　سیمیں　خیال خام　قشقہ　دَیر

۳۔ مندرجہ ذیل سوالات کے درست جوابات پر (✓) کا نشان لگائیں:

۱۔ خدائے سخن کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

الف۔ مرزا غالب　　ب۔ حیدر علی آتش　　ج۔ میر تقی میر

۲۔ میر تقی میر کا کام تمام کس بیماری نے کیا؟

الف۔ بیماری دل نے　　ب۔ دماغ کی بیماری نے　　ج۔ سر درد کی بیماری نے

۳۔ میر تقی میر نے کوں سے عہد رو رو کر کاٹا؟

الف۔ بچپن کا　　ب۔ جوانی کا　　ج۔ بڑھاپے کا

۴۔ میر تقی میر نے کس عہد میں آنکھیں موندنے کی بات کی ہے؟

الف۔ لڑکپن میں　　ب۔ نوجوانی میں　　ج۔ پیری میں

۳۔ ردیف کے لفظی معنی گھوڑے پر کسی کے پیچھے سوار ہونے کے ہیں۔ غزل میں ایک یا ایک سے زائد الفاظ جو مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے کے آخر میں تسلسل سے استعمال ہوں، ردیف کہلاتے ہیں۔ اس غزل میں "کیا" کا الفاظ ردیف ہے۔ اسی طرح قافیہ کے لفظی معنی ہیں پیچھے آنے والا۔ شاعری میں قافیہ سے مراد وہ ہم آواز الفاظ ہیں جو ردیف سے پہلے آتے ہیں مثلاً اس غزل کے مطلع میں کام، تمام قافیہ ہیں۔ آپ اس غزل کے باقی اشعار میں سے قافیے چُن کر لکھیں۔

۴۔ میر تقی میر کی اِس غزل کا کون سا شعر آپ کو پسند آیا ہے؟ پسندیدگی کی وجہ بھی لکھیں۔

۵۔ غزل اردو کی ایک اہم اور مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔ مطلع۔ قافیہ۔ ردیف۔ مقطع۔ غزل کے اِن اجزاء کے علاوہ ایک اہم اور بنیادی چیز یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر خیال اور موضوع کے لحاظ سے اپنی جگہ نہ صرف مکمل ہوتا ہے بلکہ ہر شعر ایک نیا خیال اور موضوع پیش کرتا ہے مثلاً کسی شعر میں محبت اور حسن و عشق کی بات کی جاسکتی ہے اور کسی شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ کسی شعر میں کوئی اخلاقی نکتہ بیان ہو سکتا ہے اور کسی میں مناظرِ فطرت کی تصویر کشی ہو سکتی ہے۔ میر تقی میر کی اِس غزل کے ہر شعر میں الگ الگ موضوعات کی نشان دہی کریں۔ اگر غزل کے تمام اشعار ایک ہی موضوع پر ہوں تو اُسے غزلِ مسلسل کہتے ہیں۔

سرگرمی

جب لفظ اپنے لُغوی معنی میں استعمال نہ کیا جائے اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق بھی نہ ہو تو وہ مجازِ مرسل کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یوں کہیں کہ

"اُس کا ہاتھ نہیں پہنچتا"

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس شخص میں اتنی قدرت نہیں کہ یہ کام سرانجام دے سکے۔ مجاز مرسل کے طور پر اس کے حقیقی معنی ہاتھ اور مجازی معنی قدرت میں تشبیہ کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ طاقت یا صلاحیت کا تعلق ہے۔ اس کی اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ کل کہہ کر جُز مراد لینا۔ نوشین اِسلام آباد میں رہتی ہے۔

۲۔ جُز کہہ کر کُل مراد لینا۔ شجاع نے کانوں میں انگلیاں دیں۔

۳۔ ظرف کہہ کر مظروف مراد لینا۔ مہمانوں نے مشروب کی بوتلیں پیں۔

۴۔ مظروف کہہ کر ظرف مراد لینا۔ چائے چولھے پر رکھی ہے۔

۵۔ سَبب کہہ کر مُسبّب مراد لینا۔ آج بادل خوب برسا

۶۔ مُسبّب کہہ کر سبب مراد لینا۔ افسوس اُس کے ہاتھ سے سب کچھ نکل گیا

مجاز مرسل، تشبیہ اور استعارے کی مثالیں استاد کی مدد سے بیان کریں

غزل: "غزل ایک ساز کی طرح ہے، اس کا ہر شعر ایک تار ہے۔ ہر تار کی آواز مختلف ہے مگر ان آوازوں کے امتزاج سے ایک ایسا دل نواز نغمہ ترتیب پاتا ہے جو ساز و آواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں گلال برسا دیتا ہے"۔ (ڈاکٹر وقار احمد رضوی، **تاریخ جدید اُردو غزل**)

ہدایات برائے اُساتذہ

- غزل خوانی سے قبل اُردو غزل کا مختصر تعارف اور پس منظر پیش کیا جائے۔
- میر تقی میر کی غزل میں درد و غم اور سوز و گداز کے علاوہ اُن کے یہاں صوفیانہ رجحانات کی نشاندہی کی جائے۔ (مثلاً فنا و بقا، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ)

2 دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے

اس غزل کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- غزل کے مقطع کو پہچان سکیں اور تخلص کے استعمال سے واقف ہو سکیں۔
- علم بیان کے حوالے سے تشبیہ اور استعارے کے درمیان امتیاز کر سکیں۔
- شعری محاسن کی روشنی میں کسی غزل کے یا اس کے اشعار کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

پڑھیں

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن، گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

دِل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمھارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلکِ قدرت کے قربان آتشؔ
دکھائے ہیں خوش رُو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

(کلّیاتِ آتشؔ)

خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۶۴ء۔۱۸۴۶ء)

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ آتش کے والد ان کی کم عمری ہی میں وفات پا گئے تھے۔ اس لیے آتش کی تعلیم و تربیت بہتر طور پر نہ ہو سکی۔ آتش نے نواب مرزا تقی خان کی ملازمت اختیار کی۔ لکھنؤ کے دارالسلطنت قرار پانے پر نواب کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ یہ مصحفی اور انشاء کا زمانہ تھا۔ آتش نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ مزاج میں قناعت اور توکل تھا۔ اس لیے کسی دربار سے وابستگی اختیار نہیں کی۔

آتش کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے مگر ان کے کلام میں لکھنؤ اور دلی ہر دو دبستانوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں خارجی کیفیت، داخلی نشریت سے ہم آہنگ ہے۔ کلام میں سوز و گداز، جذبۂ عشق کی صداقت، تصوّف اور مستی، محاورہ بندی، روزمرہ کی چاشنی اور وسعتِ نظر ہے۔ ان کا لب و لہجہ رجائی ہے اور وہ حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کی آواز ان کے عہد ہی کی نہیں، اُردو شاعری کے تمام ادوار کی آواز قرار پاتی ہے۔

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

الف۔ اس غزل کے دوسرے شعر میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں ان کی وضاحت کریں۔

ب۔ چوتھے شعر میں "مکاں" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ج۔ اِس غزل میں کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

د۔ پانچویں شعر میں شاعر نے کن چیزوں کو اپنا مہرباں شمار کیا ہے؟

ہ۔ آخری شعر میں شاعر کی زباں کس بات کے مزے لوٹتی ہے؟

۲۔ تلمیح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اشارہ کرنا یا اچٹتی سی نگاہ ڈالنا ہے۔ اگر نظم یا نثر میں کسی مشہور روایت، تاریخی قصّے یا واقعے کی طرف دو تین الفاظ میں اشارہ کیا جائے تو اسے تلمیح کہتے ہیں۔ آپ آتش کے اِس شعر پر غور کریں اور بتائیں کہ اِس میں کس تاریخی روایت یا واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

۳۔ درج ذیل تراکیب کا مفہوم لکھیں۔

زمینِ چمن　　دل و دیدہ　　اہلِ عالم　　اندوہ و حرماں　　کلکِ قدرت

۴۔ استعارے کے لفظی معنی اُدھار لینے کے ہیں۔ علم بیان میں اگر کوئی لفظ اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال ہو جب کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ آپ آتش کے درج ذیل شعر پر غور کریں اور استعاروں کی نشاندہی کریں:

دِل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے

۵۔ مقطع کا لفظ "قطع" سے بنا ہے جس کے معنی "کاٹنا" کے ہیں۔ شاعری میں غزل کا آخری شعر، جس میں شاعر اپنا نام یا تخلّص استعمال کرے، مقطع کہلاتا ہے۔ اگر آخری شعر میں شاعر اپنا نام یا تخلص استعمال نہ کرے تو اسے آخری شعر کہیں گے، مقطع نہیں۔ اسی طرح اگر شاعر آخری شعر سے پہلے کسی شعر میں اپنا نام استعمال کرتا ہے تو اسے بھی مقطع نہیں کہیں گے۔ آتش کی اِس غزل کے آخری شعر میں تخلّص یا نام نہیں آیا۔ اس لیے اس غزل کا کوئی مقطع نہیں ہے۔

سرگرمی

ذیل میں کچھ اشعار درج ہیں جن میں سے آپ مقطع کی شناخت کریں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

ہدایات برائے اُساتذہ

- غزل خوانی سے قبل آتشؔ کی غزل گوئی اور اس کے پس منظر کے بارے میں بتایا جائے۔
- آتشؔ کے اشعار میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ ضرب المثل کی تعریف بیان کی جائے اور آتشؔ کے اشعار سے مثالیں دی جائیں۔
- ہر شعر کی تشریح الگ الگ بیان کی جائے۔
- مطلع اور مقطع میں فرق واضح کریں۔

3 کوئی اُمید بر نہیں آتی

اس غزل کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اُردو غزل کے مختلف اسالیب سے واقف ہو سکیں۔
- اُردو غزل کی نفاستوں اور خیال آرائی سے آشنا ہو سکیں۔
- اُردو غزل میں سہلِ ممتنع اور اس کی معنی آفرینی سے آگاہ ہو سکیں۔
- ہر طرح کے اشعار کی تشریح کر سکیں اور ان کے مرکزی خیال کو الگ الگ بیان کر سکیں۔

پڑھیں

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دِن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

(دیوانِ غالبؔ: اُردو)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء)

اسد اللہ بیگ نام، پہلے اسد اور بعد میں غالبؔ تخلص کیا۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تو ان کی پرورش، ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی مگر ابھی آٹھ برس کے تھے کہ چچا بھی وفات پا گئے۔ سرکار نے ان کے خاندان کا وظیفہ مقرر کر دیا، جس سے فکرِ معاش میں کچھ کمی آئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی۔ ملّا عبدالصمد سے فارسی زبان سیکھی۔ تیرہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے شادی ہو گئی تو دہلی چلے آئے۔ پنشن میں اضافے کی کوشش میں دو برس تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ ذوق کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے۔ آخری عمر تنگ دستی اور بیماری میں گزری۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اِن کی آواز دل نشیں اور دل آویز ہی نہیں خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو فکر و فلسفے سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ہر دور کا انسان اپنے گرد و پیش کی تصویر دیکھ سکتا ہے۔ انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی۔ اُن کی تصانیف میں **دیوانِ اُردو، کلیاتِ نظم فارسی، کلیاتِ نثر فارسی، عودِ ہندی، اُردوئے معلیٰ، قاطع برہان، مہرِ نیم روز** اور دستنبو شامل ہیں۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

الف۔ غالبؔ کو کون سی صورت نظر نہیں آتی؟

ب۔ غزل کے دوسرے شعر میں غالبؔ نے نیند نہ آنے کی کیا وجہ بیان کی ہے؟

ج۔ غالبؔ کو پہلے کس بات پر ہنسی آتی تھی؟

د۔ غالبؔ کی طبیعت، کس بات پر مائل نہیں ہوتی؟

ہ۔ مقطع کے حوالے سے بتائیے کہ غالبؔ کو کعبہ جاتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

اُمید بر آنا　　صورت نظر آنا　　طبیعت آنا　　خبر آنا　　شرم آنا

۳۔ اِس غزل کے دوسرے اور چھٹے شعر کی تشریح اپنے الفاظ میں کریں۔

۴۔ درج ذیل بیانات میں سے درست کی نشاندہی کریں:

۱۔ غالبؔ بنیادی طور پر شاعر تھے:

الف۔ غزل کے　　ب۔ مرثیے کے　　ج۔ نظم کے　　د۔ قصیدے کے

۲۔ غالبؔ پنشن میں اضافے کی کوشش میں مقیم رہے:

الف۔ آگرے میں　　ب۔ کلکتے میں　　ج۔ لکھنؤ میں　　د۔ دکن میں

۳۔ اس غزل کے پانچویں شعر کا مرکزی خیال ہے:

الف۔ شاعر کو بات کرنا نہیں آتی　　ب۔ شاعر بے انتہا غم گین ہے　　ج۔ شاعر کو شرم آتی ہے　　د۔ شاعر کو احساسِ مروت ہے

سرگرمی

غالب کی کسی اور غزل کے اشعار یاد کریں۔

ہدایات برائے اُساتذہ

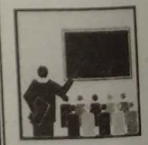

- غزل خوانی سے قبل غالبؔ کے عہد کی صورتِ حال کو بیان کیا جائے۔
- اُردو غزل میں غالبؔ کی انفرادیت، خصوصاً اُن کے یہاں مشکل پسندی کے رجحانات پر روشنی ڈالی جائے۔
- غزل کی تشریح کرتے ہوئے ہر شعر کی وضاحت میں غالبؔ ہی کے اشعار پیش کیے جائیں گے تو تفہیم کی راہ آسان ہو گی۔
- ہر شعر کا مرکزی خیال ذہن نشین کرایا جائے۔

4 لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں

اس غزل کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اُردو غزل میں اشعار کے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ان کے باہمی ربط سے واقف ہو سکیں۔
- غزل کے مجموعی تاثر کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔
- غزل کی فکری اور معنوی خوبیوں سے آگاہ ہو سکیں۔
- کسی بھی شعر کا شعری اصطلاحات کی روشنی میں جائزہ لے سکیں اور تشریح کر سکیں۔

پڑھیں

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

بُلبل کو باغباں سے نہ صیّاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

اِن حسرتوں سے کہہ دو، کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

دِن زندگی کے ختم ہوئے، شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(کلّیات ظفرؔ)

4۔ لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں

بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء۔ ۱۸۶۲ء)

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ تھے۔ ۶۳ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کامیاب نہ ہو سکی چنانچہ انگریزوں نے انھیں گرفتار کر کے برما کے دارالحکومت رنگون میں نظر بند کر دیا۔ مغل شہزادوں کو بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا۔ یہ اور اس طرح کے کئی صدمات تھے، جنھوں نے آخری عمر میں بادشاہ کو انتہائی لاچار کر دیا۔ انھوں نے رنگون ہی میں انتہائی بے بسی کے عالم میں انتقال کیا۔

ظفرؔ نے شعر و شاعری کے زمانۂ عروج کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ قلعہ معلّیٰ میں دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتیں۔ ان محفلوں میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور شیفتہؔ جیسے شاعر شریک ہوتے تھے۔ ظفر شاعری میں پہلے تو شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے پھر ذوقؔ اور اس کے بعد غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء تک وہ غالبؔ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ ظفر اپنے عہد کے پُر گو شعرا میں سے تھے۔ اُن کا دیوان چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جس میں دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ صرف غزلوں کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہے۔ ظفر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور شعر کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ اردو کے علاوہ پنجابی اور پوربی میں بھی اُن کے اشعار ملتے ہیں۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

الف۔ بادشاہ ہونے کے باوجود بہادر شاہ ظفرؔ کی اِس غزل میں بے بسی کیوں نمایاں ہے؟

ب۔ چوتھے شعر میں ''زندگی کی شام ہو گئی'' سے کیا مراد ہے؟

ج۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر نے اپنی کس حسرت کا ذکر کیا ہے؟

د۔ دوسرے شعر میں ''بُلبُل'' اور ''صیّاد'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ھ۔ غزل کے مقطع میں ''کوئے یار'' سے کیا مراد ہے؟

ء۔ بہادر شاہ ظفر نے اُجڑے دیار سے کیا مراد لی ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں:

عالمِ ناپائیدار　　عمرِ دراز　　فصلِ بہار　　دلِ داغ دار　　کُنجِ مزار　　کوئے یار

۳۔ غزل کے دوسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کو نثر کی صورت میں لکھیں۔

۴۔ بہادر شاہ ظفر کے خیال میں عالمِ ناپائیدار میں کس کی کیوں نہ بن سکی؟

۵۔ مطلع غزل کے اس پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسے مطلع نہیں بل کہ پہلا شعر کہیں گے۔ شاملِ نصاب تمام غزلوں کے مطلع تحریر کریں۔

سرگرمی

ہر طالب علم احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، ناصر کاظمی جیسے شعرا کی کوئی ایک غزل نقل کر کے لائے۔

ہدایات برائے اُساتذہ

- غزل خوانی سے قبل اِس غزل کا تاریخی پس منظر بیان کیا جائے۔
- اشعار کی تشریح کرتے ہوئے بتایا جائے کہ درد و غم غزل کا خاص مزاج ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی الم ناک قلبی واردات غزل کے اس مزاج کے عین حسبِ حال ہے۔

فرہنگ

حصّۂ نثر

۱۔ سیرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم

جنس فراواں	ایسی چیز جو کثرت میں پائی جائے	اجرام سماوی	آسمان کے ستارے اور سیارے
نادرالوجود	جو چیز نہایت کم ہو	ارفع	بہت بلند
مکروہ تحریمی	ایسی چیز جو حرام تو نہ ہو لیکن سخت ناپسند کی گئی ہو	مبالغہ آمیز	جسے بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہو
زر و سیم	مال و دولت	مدح	تعریف
فاقہ کش	بھوک کاٹنے والا	تنومند	بھاری بھر کم جسم والا، صحت مند
صاع	غلہ ناپنے کا پیمانہ	ناگہانی	اچانک آنے والی پریشانی یا مصیبت
اولوالعزم	بلند ہمت اور حوصلے والے	ابرِ کرم	رحمت کا بادل
انبیائے کبار	عظیم رسول	صیغۂ تعمیم	ایسی بات جو سب لوگوں کے لیے ہو
ودیعت	عطا کی گئی	سفارت	کسی ریاست کی نمائندگی کرنے والا
دعوتِ حق	سچائی کی دعوت	نکوسیرت	نیک کردار
وقارِ نبوّت	انبیا کی عزت	مصافحہ	ہاتھ ملانا
عزم ربانی	خدا کی مرضی	استقامت	قائم رہنا

۲۔ قومی اتفاق

بابی انت وامی	میرے ماں باپ آپ پر قربان	بمقتضائے بشریت	انسانی تقاضوں کے مطابق
تنازعات	جھگڑے۔ رنجشیں	جلب منفعت	نفع حاصل کرنا
حبل المتین	مضبوط رسی۔ پکا وسیلہ	دفعِ مضرت	نقصان سے بچنا
ریشہ گیاہ	گھاس کا تنکا	مانع	روکنے والا
مبدّل	تبدیل	مردود	ردّ کیا گیا

۳۔ غالب کا چھوٹا پن

اُمنگ	آرزو	اُسلوب:	طریقہ۔ طرز
برخلاف	اُلٹا۔ مخالف	بشرطِ اُستواری	تعلق قائم رکھنا
بعید	دُور	بلیغ	بامعنی گفتگو کرنے والا
بے گور و کفن	بغیر قبر اور کفن کے	تاخیر	دیر
تائید	حمایت	خَلِش	اضطراب

فرہنگ

دَرپَردہ	غائبانہ۔ خُفیہ طور پر	رُسوائی	بدنامی
سَرِمو انحراف	بالکل انکار	سَہل انگاری	آرام طلبی۔ سُستی
عجز و نیاز	انکسار	عَدمِ استطاعت	استطاعت نہ ہونا
غیب	پوشیدہ۔ اوجھل	فسونِ نیاز	خواہش کا خمار۔ جادو
فہم	عقل۔ سمجھ	فیکٹ	حقیقت
قانع	جو مل جائے اس پر راضی رہنے والا	قلیل	کم
لاچار	بے بس	لیک	پرانا دستور، راستا
مَحمول	لادا گیا۔ اُٹھایا گیا	متناسب	تناسب رکھنے والا
متعدّد	کئی	مجاز	حقیقت کے برعکس۔ بااختیار
مرتکب	کرنے والا	مضائقہ	دشواری۔ قباحت
مُقلّدین	پیروی کرنے والے	مُقتضی	تقاضا کرنے والا
نشاطِ کار	کام کی خوشی	وَصْل	ملاپ
ہَوس	لالچ۔ حرص	ہِمّتِ عالی	اعلیٰ ہمّت

۴۔ شاعروں کی باتیں

اعزاز	عزت کا باعث۔ صلہ	بخیل	کنجوس۔ تنگ دِل
بلاغت	حسبِ موقع گفتگو۔ کلام میں انتہائی درجے تک پہنچنا	پالکی	ڈولی
پِچھواڑا	کسی جگہ کا پچھلا حصّہ	پیری	بزرگی
تعظیم	احترام	فصیح	خوش بیان
چُہل	ہنسی۔ دل لگی	حَسبُ الطّلب	خواہش کے مطابق
خاطرِ جمعی	اطمینان	دستورِ قدیم	پرانا قانون
دو گھڑی	کچھ دیر	دَھول مارنا	تھپّڑ مارنا
دیدنی	دیکھنے کے قابل	دیوان	شاعر کے کلام کا مجموعہ
سعادت	خوش نصیبی۔ نیکی	ضَعیف	کمزور
عارِضہ	بیماری	عالمِ محویت	حیرانی کا عالم
غنیمت	کافی	فصاحت	بامعنی کلام
مُشتاق	شوق رکھنے والا	کامل	پہنچا ہوا۔ ماہر

۵۔ نصوح اور سلیم کی گفتگو

بیدارا	جگانے والا	بالاخانہ	اوپر کی منزل
گنجفہ	تاش کے پتوں کی طرح کھیلے جانے والا کھیل تین کھلاڑی کھیلتے ہیں	شطرنج	ایک کھیل جس میں شاہ، وزیر، فیل، گھوڑا اور پیادوں کے مہرے استعمال ہوتے ہیں
مُبتَدی	ابتدا کرنے والا، سیکھنے والا	کوڑیاں	کوڑی کی جمع، گھونگھے کی ایک صورت جو سمندر میں ملتا ہے کھیل کے علاوہ کسی زمانے میں اسے ادنیٰ سکے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا
آموختہ	سبق، سکھایا، پڑھایا ہُوا	منجھلا	درمیانہ
بسر و چشم	سر آنکھوں پر، خوشی سے	قِبلہ رُو	کعبے کی طرف مونھ کیے ہوئے
دالان	ایک قسم کا بڑا کمرا۔ آج کل کالاؤنج	گرفت کرنا	پکڑنا
کنجڑا	سبزی بیچنے والا	گن	خوبی
خُوبُو	عادت	کَرِشمہ	انوکھا واقعہ
پیٹھ ٹھونکنا	ہمّت بندھانا	مُطلَق	یکسر۔ بالکل
یک نہ شد دو شد	ایک نہیں دو	لچھن	بری عادت
زبوں	خراب حالت	آبدیدہ	آنسو بھر آنا
دُردُر پھٹ پھٹ	برا بھلا کہنا	تَرک کرنا	چھوڑ دینا
غیبت	کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی	چغلی	شکایت بیان کرنا
منفعت	فائدہ		

۶۔ زیور کا ڈبّا

آزُردہ	رنجیدہ	اِضطراب	بے چینی، بے قراری، گھبراہٹ
ایشور	ہندو مت میں خدا	بِساطی	چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے والا۔ پھیری والا
پاپ	گناہ	پولیٹیکل	سیاسی۔Political
پَو بارہ ہونا	زیادہ فائدے میں ہونا	پیش بندی	وقت سے پہلے بندوبست کرنا
تذبذب	جھجک، شک و شبہہ، ہچکچاہٹ	تلخ	کڑوا
تھر تھرانا	کانپنا	چہرہ فق پڑنا	اچانک مشکل میں چہرے کا رنگ اڑ جانا
خَدشہ	ڈر، خوف	خَلِش	چبھن
خمیازہ	سزا۔ نقصان	زبان طرار	زبان کی تیز
ساعت	گھڑی۔ لمحہ	وساطت	حوالہ، ذریعہ، واسطہ
سرُور	لطف، مزا	سوشل	سماجی۔Social

شیریں	میٹھا	فراخ دل	کھلے دل والا۔ سخی
کاہلُ الوجود	کام چور	گہنا	زیور
مُتوحش	خوفزدہ، بھیانک، پریشان	ناز	فخر

۷۔ آرام و سکون

اُلجھن	پریشانی	بے طرح	بہت زیادہ
پرندے کا پر نہ مارنا	جہاں کوئی آجا نہ سکتا ہو	تردّد	سوچ، فکر
تقویت بخشنا	طاقت دینا	جوں نہ رینگنا	اثر نہ ہونا
خاک اثر نہ ہونا	بالکل اثر نہ ہونا	علیل	بیمار
مالٹڈ ملک	ذائقہ دار دودھ	مُقوّی	طاقت دینے والا
نصیبِ دشمناں	دوست کے بیمار ہونے پر کہتے ہیں کہ یہ تو دشمن کے نصیب ہونا چاہیں		

۸۔ نئی ہمسائی

اُفتاد	مشکل۔ مصیبت	اندیشہ	ڈر
اے بسا آرزو	آرزو کے پورا نہ ہونے پر	پائنتی	چارپائی پر پیروں کی طرف
کہ خاک شُدہ	افسوس سے کہتے ہیں	خوش وضع	خوبصورت
زخم رسیدہ	زخم کھایا ہوا	لگائی بجھائی کرنا	ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا۔ فتنہ پیدا کرنا۔ غیبت
معمّا	الجھاوا		

۹۔ نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر

اتالیق	استاد	بَل آنا	ناپسندیدگی کا اظہار
بے سروپا	بے تُکی	تناول فرمانا	کھانا کھانا
تعظیم	عزّت کرنا	چوبدار:	وہ نوکر جو عصا لے کر امیروں کے آگے چلتا ہے
رسُوخ	ربط ضبط۔ اثر	سائیس	گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے والا
سرتاپا	سر سے پاؤں تک	شامتِ اعمال	کیے کی سزا
صحبتیں	ملاقاتیں	فراغت	فُرصت
مِثل	ملتا ہوا	محو	مصروف
مصاحبین	قریبی ساتھی، مصاحب کی جمع	نوبت	کسی کام کے ہونے کا وقت۔ ایک ساز کا نام۔ برطانیہ کی ایک ملکہ کا نام

۱۰۔ سماج

اجارہ دار	ٹھیکے دار۔ قابض	پرماتما	ہندی میں اللہ کا ایک نام
پریم	پیار	ٹانسل	گلے کے غدود۔ Tonsil

خطائیں	غلطیاں	مٹی پلید ہونا	حالت خراب ہونا
مسرور	خوش		

۱۱۔ کاربکاؤ ہے

اضطرار	پریشانی	بے ہودہ گفتاری	فضول بول چال
پائیدار	زیادہ دیر تک باقی رہنے والا	جملہ اندیشہ شہر	لوگوں کا ڈر
خطِ مستقیم	سیدھا خط یا راستہ	دامِ تزویر	مکر کا جال
دشتِ امکاں	ممکن صحرا، مراد ہے دُنیا	ڈرابیک	خامی۔Drawback
رعشہ	کپکپاہٹ	سبک سر ہونا	بوجھ اتر جانا
سرگراں ہونا	بوجھل پن محسوس کرنا	شعائرِ اسلام	اسلام کے اصول
عالمِ پیری	بڑھاپا	فرنگ	انگلستان
قصّہ کوتاہ	قصہ مختصر	کریش پروگرام	مختصر مگر جامع منصوبہ۔Crash Programme
لبِّ لُباب	مختصر حقیقت	متشرّع	شریعت کا پابند۔پارسا
محیطِ زبوں	خراب حال	مقفّی	قافیہ بند
موافقت	سازگار		

۱۲۔ خطوط بنام مدیر

مسلمہ	مانی ہوئی۔تسلیم شدہ	قاری	پڑھنے والا
مندرجات	درج یا شامل نکات اور موضوعات اور موضوعات	مراسلہ	بھیجا گیا یعنی خط
موافق	مطابق۔راس۔متفق	جرائد	جریدہ کی جمع۔رسالے
فیچر	اخبار میں کسی مسئلے کا تجزیاتی مطالعہ	رجوع کرنا	پیش کرنا۔لوٹنا۔توجہ کرنا
کالم	اخبار یا رسالے میں صفحے کی پیمایش کی اکائی۔اخبار یا رسالے میں مستقل عنوان سے باقاعدگی سے شائع ہونے والی تحریر		

۱۳۔ ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطے کی دُنیا

ابلاغ	پہنچنا/پہنچانا	شومیٔ قسمت	بد قسمتی/بد نصیبی
سماج	معاشرہ	قصۂ پارینہ	پرانی بات
ترویج	رواج دینا	بازیچۂ اطفال	آسان کام، بچوں کا کھیل
استواری	قائم کرنا	عیاں	واضح

دوچند	زیادہ	محیر العقول	عقل کو حیرت میں ڈالنے والی
اعجازِ مسیحا	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ	انحطاط	زوال
اورنگِ سلیمان	حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت	حلاوت	مٹھاس

حصّہ نظم

ا۔ ربِّ کائنات

آشنائی	واقفیت	اَبد	وہ زمانہ جس کی انتہا نہ ہو
اَزل	وہ زمانہ جس کی ابتدا نہ ہو	اہلِ حال	صوفی منش۔ جذب والے لوگ
حال	حالت۔ کیفیت	سُکتہ	حیرت یا دکھ سے بے حس و حرکت ہو جانا
قال	زبان سے کچھ کہنا		

۲۔ نعت

بے کس	جن کا کوئی نہ ہو۔ بے بس	دردمند	درد رکھنے والا
رفیق	دوست	سقیم	غلطی کرنے والا۔ گنہگار
شفیق	شفقت کرنے والا	فُغاں	فریاد بھری آواز
قدرداں	قدر کرنے والا		

۳۔ برسات کی بہاریں

اٹاری	بالاخانہ۔ کوٹھا	اُسارا	تعمیر کیا۔ دیوار کھڑی کی
پکھیرو	پرندہ	پنکھ	پَر۔ بازو
تاب	طاقت	جل تھل	خشکی کا پانی سے بھر جانا
جھمجھماوٹ	رِم جھم	گلزار	پھولوں کا باغ
لہلہاہٹ	خوشی سے جھومنا	نقّارہ	ڈھول جیسا ساز جو لکڑی کے پیالے کی طرح ہوتا ہے جس کی کھلی طرف چمڑا مڑھ دیتے ہیں

۴۔ دُعا

اہلِ صفا	نیک لوگ	پُرسوز	پُردرد
داغ	نشان۔ زخم	روبرو	آمنے سامنے
سبو	صراحی	شرابِ کہن	پرانی شراب
صبحِ نشور	یومِ حساب کی صبح	کاخ و کو	محل، عالی شان عمارتیں
کدو	صراحی۔ پیالہ	لالہ	ایک پھول
لامکان	جہتوں سے ماوراء کائنات	لبِ آب جو	ندی کا کنارہ
مطلع	سورج نکلنے کی جگہ	نشیمن	گھونسلا

نوا	آواز	جستجو	تلاش
سرخوش	مسرور، مگن، بے خود، مست	سُرور	کیف، خوشی، لذت
حُضور	سامنے، خدمت میں، بارگاہ میں	خدائی	راج، حکمرانی، وقت، کائنات

حصّۂ غزل

۱۔ میر تقی میرؔ

عہدِ جوانی	جوانی کا وقت	تہمت	الزام
بیماریِ دل	دل کی بیماری۔ مراد عشق	عبث	بے کار۔ خواہ مخواہ
مختاری	اختیار	سپید و سیہ	سفید اور کالا۔ مراد ساری دنیا
جوں توں کر کے	بڑی مشکل سے، کسی نہ کسی طرح	سیمیں	رُوپہلا، چاندی کا، مراد حسین خوب صورت
دَیر	وہ عبادت گاہ جہاں ایک اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش ہو۔ بُت خانہ، مندر، گرجا	قشقہ	پیشانی پر صندل کیا زعفران کے دو نشانات۔ ٹیکا۔ تِلک جو ہندو ماتھے پر لگاتے ہیں۔
ساعد	کلائی، ہاتھ۔ قدرت اور قوت	خیالِ خام	بے کار، بے بنیاد توقع یا خواہش

۲۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ

اندوہ و حرماں	رنج۔ ناامیدی۔ محرومی	دارا	ایرانی بادشاہ جس نے سکندر سے شکست کھائی
دہن	مونھ۔ چہرہ	سکندر	مشہور یونانی بادشاہ
گمان	شک و شبہ۔ وہم	گل کھلانا	کسی انوکھی بات کو ظاہر کرنا

۳۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

بَر آنا	پورا ہونا	زبان کٹنا	کچھ کہہ نہ پانا
معیّن	مقرر، طے شدہ		

۴۔ بہادر شاہ ظفرؔ

دیار	بستی، شہر، علاقہ	کنجِ مزار	قبر کا گوشہ
دلِ داغدار	زخمی دل	کوئے یار	محبوب کی گلی
صیّاد	شکاری	ناپائدار	عارضی۔ کمزور

مؤلفین

پروفیسر ڈاکٹر خالد اقبال یاسرؔ (تمغۂ امتیاز)

بھیرہ، ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (تاریخ) اور قائداعظم یونیورسٹی سے ایم ایس سی (مطالعۂ پاکستان) کرنے کے بعد اُنھوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اقبالیات میں ایم۔ فل اور جامعہ اسلامیہ، بہاولپور سے اُردو میں پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ وہ طویل عرصے تک اکادمی ادبیات کے سہ ماہی ادبی جریدے ''ادبیات'' کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ اُن کی چار شعری مجموعے **دروبست**، **گردش**، **رُخصتی** اور **مزاج** شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تنقید و تحقیق کے حوالے سے تین کتب **احوال و آثار**، **ادب اور زمانہ** اور **جدید تحریکات اور اقبال** بھی سامنے آچکی ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں بطور ناظمِ اعلیٰ اُردو سائنس بورڈ سبکدوش ہوئے۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر صدرِ پاکستان نے ۲۰۱۱ء میں انھیں سول ایوارڈ تمغائے امتیاز عطا کیا۔ وہ نمل یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ تصنیف و ترجمہ کے ناظم بھی رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد

وہ گزشتہ تین دہائیوں سے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ تنقید و تحقیق کے علاوہ تالیف، تدوین اور ادارت کے حوالے سے بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مختلف موضوعات پر اب تک ان کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اُردو اور عربی میں ایم اے کرنے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد سے اُردو میں ایم فل اور بعد ازاں اُردو ہی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور کی طرف سے اُنھوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالہ نگاروں کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ وہ یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں صدرِ شعبہ اُردو رہے اور ۲۰۱۲ء میں سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر امجد اقبال

پروفیسر امجد اقبال عرصہ بیس سال سے اُردو مضمون کی تدریس و تعلم کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ 2002ء میں بطور لیکچرار شعبہ اردو، اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز G-10/4 اسلام آباد سے ملازمت کا آغاز کیا اور اس وقت بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ دس بارہ برس تک کالج ہذا میں بطور صدر شعبہ اُردو بھی خدمات سرانجام دیں۔ وفاقی تعلیمی بورڈ، اسلام آباد جیسے پروفیشنل ادارے میں متعدد بار کمیٹی آف کورسز کے رکن کی حیثیت سے بھی سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح پر اپنی خدمات پیش کر چکے ہیں۔ سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری کلاسز کے اردو لازمی کے ماڈل پرچوں کی تیاری میں ٹیم کا حصہ رہے ہیں۔ مقامی اخبارات و رسائل میں ادبی موضوعات پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ خطۂ پوٹھوہار بالخصوص راول پنڈی کی علمی و ادبی روایت کو زندہ جاوید کرنے والی دو شخصیات؛ عزیز ملک اور آغا صدیق حسن ضیاؔ کے فن اور شخصیت پر دو کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی انٹر میڈیٹ اُردو میں دو یونٹ ''پاکستانی ادب'' اور ''طنز و مزاح'' کے عنوانات سے شاملِ نصاب ہیں۔

منظور شدہ کیپیٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن
(کریکولم ڈویلپمنٹ اینڈ ٹیکسٹ بک پروڈکشن ونگ)
گورنمنٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد
بحوالہ خط نمبر F.6-3/2011-AEA (Langs) مورخہ 02-02-2012

ترانۂ قومی

پاک سرزمین شاد باد ۔ کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ۔ ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام ۔ قوتِ اخوتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت ۔ پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچم ستارہ و ہلال ۔ رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال ۔ جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

حفیظ
۱۷ مارچ ۵۴ء

نیشنل بک فاؤنڈیشن
بطور
وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ، اسلام آباد